قرآن اور فلسفۂ احکام

جوابات از

علمائے قم و نجف

مرتبہ

مجاہد حسین حرؔ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔

نام کتاب .... قرآن اور فلسفۂ احکام

جوابات از .... علمائے قم و نجف

مرتبہ .... مجاہد حسین حرؔ

پروف ریڈنگ ....

کمپوزنگ .... قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس فیز ۴

ناشر .... مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ ....

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

0321-4971214،042-37361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

0333-5234311

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم وتفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی انشاء اللہ العزیز شائع کی جاتی رہے گی۔

موجودہ کتاب "قرآن اور فلسفۂ احکام" قرآنی معرفت کا ایک سلسلہ ہے۔ قرآن مجید سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک مفید تحفہ ہو گی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکرگزار ہوں گے۔ ادارہ کے ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست کتاب

اسلام کی نظر میں قصاص کا فلسفہ کیا ہے؟	7
دو بہنوں کے ساتھ ایک ہی وقت میں شادی حرام ہونے کا فلسفہ کیا ہے؟	13
ہفتے کا دن یہودیوں کے لئے کیوں سزا کا دن ہے؟ کیا عیسائیوں کے لئے اتوار کا دن سزا کا دن ہے؟	16
مقام ابراہیمؑ کیا ہے؟ اور اس سے مقصد و مراد کیا ہے؟	21
ایک مرد کی گواہی دو عورت کے برابر کیوں ہے؟	26
قرآن مجید کے حروف مقطعات کے کیا معنی ہیں؟	31
قرآن مجید میں کتاب مبین اور رطب و یابس (خشک وتر) کا مراد کیا ہے؟	35
قرآن مجید میں خداوند عالم کے حیلہ سے کیا مراد ہے؟	47
جمادات اور نباتات خداوند متعال کی تسبیح کیسے کرتے ہیں؟	50
"انا سنلقی علیك قولاً ثقیلا" میں قول ثقیل سے کیا مراد ہے؟	56
قرآن کریم میں "فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ" کیوں آیا ہے جب کہ بشارت کے مثبت معنی ہوتے ہیں؟	59

اسلامی روایات کے مطابق روح کی ماہیت کیا ہے اور قرآن مجید میں اس
سلسلہ میں کیوں وضاحت نہیں کی گئی ہے؟ 61
بداء لوح محفوظ، کتاب مبین، لوح محو و اثبات کا مفہوم اور معنی کیا ہیں؟ 69
قرآن مجید میں بیان ہوئے سات آسمانوں کے کیا معنی ہیں؟ 76
شراب طہور کیا ہے؟ 82
آیہ شریفہ "سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ" کیسے رشوت کے حرام
ہونے پر دلالت کرتی ہے؟ 89
قرآن مجید کے نظریہ کے مطابق خود آگاہی کے معنی کیا ہیں؟ 93
کیا قرآن مجید کی نظر میں حکمت اور علم کے درمیان کوئی فرق ہے؟ 100
قرآنی رو سے انسان ایک بڑا ظالم اور نادان وجود ہے یا خلیفۃ اللہ؟ 109
"قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ج" ... کے کیا معنی ہیں؟ اور اس میں
"فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط ... فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ط"
... کی تکرار کی وجہ کیا ہے؟ 113

اسلام کی نظر میں قصاص کا فلسفہ کیا ہے؟

مختصر جواب

قصاص اسلام کے احکام سزا میں سے ہے جس کو قرآن مجید نے سماج کیلئے حیات جانا ہے۔ قصاص کے حکم کی تشریع، بے مقصد اور بے انصاف انتقاموں کو روکنے کیلئے نیز مجرموں کو عام شہریوں کے قتل کی جرات کرنے یا انہیں مجروح کرنے سے روکنے کے لئے قرار دی گئی ہے جو سالم اور صحت مند سماج کی حیات اس کی حفاظت اور عمومی راحت و آرام، ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری اور متقابل ذمہ داریوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ بات سماجی حیات کے ارکان اور اصول کی حفاظت سے وابستہ ہے، قصاص کا حکم مجرموں کے مقابلے میں سماج کے اہم رکن یعنی افراد کی جان کی حفاظت کیلئے وضع کیا ہے۔

تفصیلی جوابات

اسلام کے احکام سزا میں ایک حکم قصاص ہے، لغت میں قصاص کے معنی کسی چیز کے اثر کے تلاش کرنے کے ہیں [1] اور اصطلاح میں جرم کے اثر کو ایسے تلاش کرنا کہ قصاص کر لینے والا ویسی ہی سزا مجرم کو دے جرم مجرم نے انجام دیا ہے۔ [2]

قصاص ایک قدیم انسانی قانونی ہے جو اس کے زمان ابلاغ سے لیکر ہمارے زمانے تک موجود ہے کتاب تفسیر نمونہ کے مولف نے سورہ بقرہ کی آیت شریفہ ۱۷۹ کے ذیل میں فلسفہ قصاص کو بیان فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ: جاہل عربوں کی رسم یہ تھی کہ اگر ان کے

قبیلے کا کوئی فرد مارا جاتا تھا تو وہ یہ فیصلہ کرتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے وہ قاتل کے قبیلے کے افراد کو مارڈالیں اور یہ فکر اتنی وسعت پا چکی تھی کہ وہ ایک فرد کے مرنے کے ساتھ قاتل کے پورے قبیلے کو ختم کر دیتے تھے، آیہ شریفہ نازل ہوئی جس کے ذریعے قصاص کا باانصاف حکم بیان ہوا ہے[3]۔ کیونکہ یہ حالت وسیع طور پر انتقامی کیفیت اور طولانی لڑائیوں کا سبب بنتی تھی۔

لیکن اسلام نے قانون قصاص کو انتقامی قتل کا جانشین بنایا، اسلام ایک طرف اسے گلی کوچوں کی انتقامی کاروائیوں سے نکال کر عدالت اور قاضی کے دائرہ میں لایا اور اس طرح قصاص کو ایک غیر قانونی کام سے ایک ایسے عمل میں تبدیل کیا کہ جرم کی پہچان، مجرم اور جرم کے حدود کیلئے ایک عدالت قائم ہوجائے تا کہ ہر طرح کی سزا اسی کی نظارت میں عدل و انصاف کے ساتھ دی جائے۔ اسے انتقامی صورت حال سے نکال کر قصاص کا نام دیا، اور اس زمانے میں جن غلط قوانین نے سماج کو گھیر رکھا تھا انہیں ختم کر دیا۔ ایک شخص کے مقابلے میں کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا انتقام لینا تھا اور ایسا اندھا انتقام کہ جو مجرم اور قاتل کے گھرانے تک ہی محدود نہیں رہتا تھا، جبکہ قرآن مجید بیان کرتا ہے: اور ہم نے توریت میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ جان کا بدلہ جان اور آنکھ کا بدلہ آنکھ اور ناک کا بدلہ ناک اور کان کا بدلہ کان اور دانت کا بدلہ دانت ہے اور زخموں کا بھی بدلہ لیا جائے گا اب اگر کوئی شخص معاف کر دے تو یہ اس کے گناہوں کا بھی کفارہ ہوجائے گا اور جو بھی خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کرے گا وہ ظالموں میں سے شمار ہوگا[4]

اگر تمہارا ایک شخص مار ڈالا گیا، تو تمہیں بھی اس کے مقابلے میں ایک ہی آدمی سے جو مجرم اور قصوروار ہے قصاص کر لینا چاہئے اور اگر مقتول کا گھرانہ راضی ہوگیا تو اس کو بخش دیا جائے گا یا اس سے دیہ حاصل کیا جائے گا۔ آج تک قصاص کے اس حکم کے بدلے کوئی بہتر

حکم جا گزین نہیں ہوا ہے جو مقتولین کے پسماندگان کو راضی کر سکے۔ اس طرح مجرم بھی مساوی طور پر سزا دیکھے تا کہ اس کے لئے اور دوسروں کے لئے عبرت کا سبق بن جائے۔ اور لوگ آسانی سے قتل اور خون نہ بہائیں، یا دوسرے لوگوں کو مارنے کے بعد چند سال جیل میں کاٹ کر اور دوبارہ آزاد ہو کر لوگوں کو خطرے میں نہ ڈالیں۔

اسلام ہر موضوع میں مسائل کو حقیقت کے ساتھ دیکھتا ہے اور اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو جانچ لیتا ہے بے گناہوں کے خون کے مسئلے میں بھی حق مطلب کو بغیر کسی شدت یا سہل انگاری کے بیان کرتا ہے، نہ کہ یہودیت کے منحرف دین کی طرح صرف قصاص پر اکتفاء کرتا ہے اور نہ ہی عیسائیت کی طرح صرف بخشش اور عفو اور دیہ لینے کی نصیحت کرتا ہے، کیونکہ صرف عفو کرنا جرات کا سبب بنتا ہے اور صرف قصاص شدت پسندی اور انتقام جوئی کا باعث[5]۔ (بلکہ اسلام قصاص بھی اور عفو و بخشش اور دیہ کو بھی منظور کرتا ہے تا کہ اعتدال برقرار رہے)

قصاص کے تشریع کی سب سے اہم دلیل قرآن مجید میں سماج کی حفاظت کو جانا گیا ہے خداوند متعال نے سورہ بقرہ میں قصاص کے فلسفے کے بارے میں فرمایا ہے: صاحبانِ عقل تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے کہ شاید تم اس طرح متقی بن جاؤ[6]

یعنی قصاص کا مقصد موت کے گھاٹ اتارنا ہیں ہے بلکہ مقصد حیات ہے، اس کا مقصد، صرف امور کی ترمیم اور فرد یا سماج کو اپنی پہلی حالت پر لوٹا دینا ہے، اگر کوئی بغیر دلیل کے سماج کے قانونی ارکان کے بغیر قتل کا اقدام کرے تو سماجی حیات خطرے میں پڑتی ہے اور قصاص سماج اور فرد کی حیات کی ضمانت ہے۔

کبھی بعض افراد حکم قصاص پر اشکال کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ قصاص اس بات کا سبب بنتا ہے کہ ایک اور آدمی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، جبکہ انسانی رحمت اور رافت اس

بات کی متقاضی ہے کہ کسی جان کا قصاص نہ ہوجائے۔

اس کے جواب میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ، ہاں، لیکن ہر طرح کی رافت اور رحمت پسندیدہ اور با مصلحت نہیں ہے اور ہر طرح کا رحم کرنا بھی فضیلت نہیں جانا جائے گا، کیونکہ کسی مجرم اور قسی القلب (جس کیلئے لوگوں کو قتل کردینا آسان کام ہے(پر رحم کرنا اور ایسے فرد پر جو نافرمان ہے اور جو دوسروں کے مال اور جان اور عزت پر حملہ کرتا ہے، اس پر رحم کرنا صالح افراد پر ستم کرنے کے برابر ہے، اگر ہم مطلق طور پر اور بغیر کسی قید و شرط کے رحم کرنے پر عمل کریں تو نظام میں فساد پیدا ہوگا اور انسانیت ہلاکت میں پڑ جائے گی اور انسانی فضائل تباہ ہوجائیں گے۔[7]

شہید مطہری اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں: اس طرح کے مارنے کو آپ مارنا اور مرنا اور مار ڈالنا نہ کہیں اس کو حیات اور زندگی سمجھیں، لیکن اس فرد کی حیات، بلکہ سماج کی حیات، یعنی ایک مجرم کے قصاص سے، آپ نے سماج کے افراد کی حیات کو محفوظ کردیا، اگر آپ قاتل کو نہیں روکیں گے تو کل وہ ایک اور آدمی کو مار ڈالے گا، کل ایسے دسیوں آدمی نکلیں گے جو دسیوں آدمیوں کو مار ڈالیں گے، اس کو آپ سماج کے افراد کا کم ہونا مت جانیں، یعنی قصاص کے معنی انسان کے ساتھ دشمنی کرنے کے نہیں ہیں بلکہ، یہ انسان کے ساتھ دوستی کرنے کا نام ہے[8]

پس اگر انسان اخلاقی کمال کے مراتب تک پہنچ گیا، قصاص یعنی امور کی ترمیم اور انفرادی اور اجتماعی حیات کی فراہمی اور دوسرے اسلوب سے ایک انسان کا کم ہونا ترجیح رکھتا ہے، کیونکہ مقصد موت کے گھات اتارنا نہیں ہے بلکہ مقصد حیات ہے اور خداوند متعال اپنے سارے بندوں کی نسبت رحمۃ للعالمین ہے اسی لئے آیہ شریفہ متفکر افراد اور انسانوں کے ذہنوں کو خطاب کرتی ہے نہ کہ احساسات اور عواطف کے ساتھ، اور ارشاد ہے قصاص

تمہارے لئے حیات اور زندگی ہے اے صاحبان عقل

پاک و پاکیزہ اور صحت مند و سالم سماجی حیات، عمومی، آرام، محفوظ، اور متقابل حقوق اور ذمہ داریوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اور عمومی آرام اور حفاظت، سماجی حیات کے اصول اور بنیاری ارکان کی حفاظت سے جڑے ہوئے ہیں، ایک استقرائی نظر اور حصر پر تاکید کرنے کے بغیر سماجی حیات کے اصلی عناصر، دین، جان، مال، احترام، انسانی عزت، انسانی عقل پر مشتمل ہے، یہ اصول جو امام غزالی کے بعد ہمارے علماء اور فقہاء کی توجہ کا مرکز بنے واقعی طور پر ایک صحت مند سماج کی بنیادوں کو تشکیل دیتے ہیں، اور جو اجزاء اور مجموعے اس کے ذیل میں موجود ہیں وہ سماج کی سبھی معتبر اور اہم مصلحتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔[9]

مندرجہ بالا مطالب کو مدنظر رکھ کر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اسلام کے احکام سزا کا مقصد یا اس کا اہم ترین ہدف دینی اور سماجی نظام کی حفاظت ہے اور یہ بلند مقصد صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان اصلاح اور تربیت کے ذریعے یا سزاوں کے ڈر سے ایسے اعمال کا مرتکب نہ ہو جن سے اجتماعی نظام کو نقصان پہنچتا ہے۔

حواشی

[1] ابن منظور، لسان العرب، ج ۱۱، ص ۱۹۰۔

[2] والمراد بہ ہنا استبقاء اثر الجنایۃ من قتل او قطع اور ضرب اور جرح، فکان المتقص یتبع اثر الجانی، فیفعل مثلہ نجفی، محمد حسین، جواھر الکلام محقق، قوچانی، عباس ج ۴۳ ص ۷ دار الاحیاء الثراث العربی، بیروت، چھاپ ہفتم

[3] مکارم، ناصر تفسیر نمونہ، ج ۱، س ۶۰۳ تھران، دار الکتب الاسلامیۃ، ۱۳۷۴ ہ۔ش۔

[4]: وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَ الْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ وَ الْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ

[5] تفسیر نمونہ ج ۱،ص ۶۰۷۔

[6] سورہ بقرہ ۱۷۹۔

[7] علامہ طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیزان، ترجمہ موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ج ۱ س ۶۶۷، قم، دفتر انتشارات جامعہ مدرسین۔

[8] مطہری مرتضی، مجموعہ آثار، ج ۲۲ ص ۷۴۹، تھران انتشارات صدرا

[9] خسرو شاھی، قدرت اللہ فلسفہ قصاص از دیدگاہ اسلام، ص ۱۹۸ قم بوستان کتاب، طبع اول ۱۳۸۰

دو بہنوں کے ساتھ ایک ہی وقت میں شادی حرام ہونے کا فلسفہ کیا ہے؟

اسلام کی شریعت مقدس میں ایک وقت میں دو بہنوں سے شادی کرنا جائز نہیں ہے، اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ اگر دو یا اس سے زیادہ بہنوں سے شادی ایک ہی وقت میں ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں، جب بھی کوئی مرد کسی عورت سے عقد (نکاح) کرے تو جب تک وہ عورت اس کے عقد میں ہے وہ شخص بیوی کی بہن سے شادی نہیں کرسکتا، عقد چاہے دائمہ ہو یا موقت، بلکہ طلاق کے بعد بھی عدہ کے ختم ہونے تک (جب کہ عدہ رجعی ہو) تو اس کی بہن سے شادی نہیں کرسکتا، لیکن جب اپنی بیوی کو طلاق دے دے یا وہ دنیا سے گزر جائے اور عدہ ختم ہو جائے تو اس بیوی کی بہن سے شادی کرسکتا ہے۔[1]

اسلام میں ایک وقت میں دو بہنوں کے ساتھ شادی سے منع کرنے کا فلسفہ شاید یہ ہو:

ایک یہ کہ: بیوی کی شخصیت اور حرمت محفوظ رہے جیسا کہ بیوی کی بھانجی اور بھتیجی سے شادی میں بیوی کی رضایت شرط ہے۔

دوسرے: دو بہنیں ہم نسب اور بہن ہونے کے سبب ایک دوسرے سے بہت زیادہ

مانوس ہوتی ہیں لیکن جب ایک دوسرے کی رقیب بن جائیں گی تو اس محبت و پیار کو محفوظ نہیں رکھ سکتیں، اس طرح ان کی شفقت ومحبت میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے گا جو زندگی کے لئے نقصان دہ ہے اور خاندان کی بنیاد بکھر جائے گی، اس لئے کہ ہمیشہ پیار ومحبت اور رقابت کا جذبہ ان کے اندر کشمکش کی صورت میں موجود رہے گا۔[2]

تیسرے: کہ یہ بہن کے شوہر سے شادی کرنا عورتوں کی طبیعت اور مزاج کے سازگار نہیں ہے کیونکہ معمولاً عورتیں بہن کے شوہر سے قرابت و رشتہ داری کا احساس کرتے ہیں اور اسے اپنے خاندان کا حصہ سمجھتی ہیں۔

آخر میں اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اگر چہ یہ بات اپنی جگہ ثابت ہو چکی ہے احکام الٰہی مصلحت و مفسدہ کی بنیاد پر وضع کئے گئے ہیں لیکن ان مصالح و مفاسد کا جزئیات اور مصادیق سے کشف کرنا بہت مشکل ہے، اس لئے کہ:

ایک: مختلف علمی میدانوں میں وسیع امکانات کی ضرورت ہے۔

دوسرے: انسان علم وصنعت کے لحاظ سے جتنا بھی ترقی کرلے پھر بھی اس کی معلومات مجہولات کے مقابلہ میں سمندر کے سامنے ایک قطرہ کے مانند ہے: تمہیں تھوڑے سے علم کے سوا کچھ اور عطا نہیں کیا گیا ہے (سورۂ اسراء، آیت 85)

اولیائے دین خدا کی جانب سے سارے احکام کا فلسفہ بیان نہ کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ انسان کہ جس کے لئے ابھی تک سارے علمی حقائق کشف نہیں ہوئے ہیں اسے احکام کے تمام راز بتانا ایک معما کے مانند ہے جو بعض اور سننے والوں کے لئے نفرت کا سبب بن سکتا ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: جس چیز کو نہیں جانتے اس کے دشمن ہوتے ہیں [3] اسی لئے اولیائے خدا نے لوگوں کی سمجھ کے مطابق بعض احکام کے فلسفہ اور سبب کی طرف اشارہ

کیا ہے۔

جب کہ دین وشریعت کا مقصد انسانوں کوعلمی وعملی خوبیوں سے آراستہ کر کے فکری وعملی برائیوں سے دور کرنا ہے اور یہ مقصد شریعت پر عمل پیرا رہ کر ہی حاصل ہوسکتا ہے چاہے لوگ احکام کا فلسفہ اور اسباب سے بے خبر کیوں نہ ہوں۔

بالکل ایسے ہی جیسے ایک بیمار کو ڈاکٹر کے حکم پر عمل کر کے شفا حاصل ہوتی ہے چاہے وہ دوا اور ڈاکٹر کے حکم کے فلسفہ کو نہیں جانتا۔

اس کے علاوہ مؤمنین کو چونکہ یہ اطمینان ویقین ہے کہ یہ دینی احکام ان حضرات کی جانب سے صادر ہوتے ہیں جن کے علم و دانش میں خطا کی گنجائش نہیں ہے، لہٰذا انہیں ان احکام کے مفید اور مؤثر ہونے کا بھی یقین ہے۔

حواشی

[1] توضیح المسائل مراجع، ج2، ص2390و2391۔

[2] تفسیر نمونہ، ج3، ص368۔

[3] الناس اعداء ما جھلو، گزیدہ میزان الحکمۃ، ج1، ص214

ہفتے کا دن یہودیوں کے لئے کیوں سزا کا دن ہے؟ کیا عیسائیوں کے لئے اتوار کا دن سزا کا دن ہے؟

مختصر جواب

دینی تعلیمات میں منع کیے گئے مسائل میں سے ایک، نافرمانی کی توجیہ کرنا ہے۔ قرآن مجید نے بعض قانون شکن یہودیوں کو اصحاب سبت کے عنوان سے یاد کیا ہے اور ان پر نفرین کی گئی ہے۔ کیونکہ سنیچر کے دن مچھلی پکڑنا ان کے لئے حرام تھا اور اس دن مشیت الٰہی سے، مچھلیاں کثرت سے پانی کے اوپر اور ساحل کے نزدیک ظاہر ہوتی تھیں، تا کہ یہودیوں کی طرف سے قانون الٰہی کی وفاداری کا امتحان لیا جائے، لیکن مچھلیوں کی بڑی تعداد دیکھ کر یہودیوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا تھا اور وہ سنیچر کے دن جال پھیلاتے تھے اور دوسرے دن اسے کھینچتے تھے اور اپنی قانون شکنی اور نافرمانی کی یوں توجیہ کرتے تھے کہ: ہم نے سنیچر کے دن مچھلیاں نہیں پکڑی ہیں بلکہ دوسرے دن کے لئے ماہی پکڑنے کے مقدمات انجام دیئے ہیں۔ مقدمات تیار کرنا تو ہم پر حرام نہیں ہوا ہے؛

اس بنا پر، یہودیوں کو سزا دینے کی وجہ، خدا کے حکم سے ان کی نافرمانی تھی۔ البتہ یہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے نہ کہ یہودیوں کا، کیونکہ وہ سنیچر کو خداوند متعال کے آرام کا دن جانتے ہیں، قرآن مجید کی آیات اور روایتیں اس قول کو مسترد کر کے اسے باطل قرار دیتی ہیں۔

سنیچر یا اتوار کے احترام کے بارے میں یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض عیسائی جو سبتیون (سنیچر والے) کے نام سے مشہور ہیں، یہودیوں کا جیسا اعتقاد رکھتے ہیں کہ سنیچر ایک مقدس دن ہے، اس لئے اس دن کوئی کام نہیں کرتے ہیں اور اتوار کے دن کام کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ انجیل کی آیات کے مطابق، تورات کے دس احکام اپنی جگہ پر باقی ہیں اور حضرت عیسیٰ ان کو مکمل اور نافذ کرنے کے لئے آئے تھے۔ دوسری جانب غیر سبتی عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق، چونکہ حضرت عیسیٰؑ کی شہادت جمعہ کے دن واقع ہوئی ہے اور حضرت تین دن کے بعد، عالم ارواح سے اٹھ کر اپنے شاگردوں کے پاس ظاہر ہوئے ہیں، اور حضرت عیسیٰؑ کا قیام اتوار کے دن تھا اس لئے وہ دن عیسائیوں کے لئے مذہبی عید ہے۔

مذکورہ بیان، یعنی اتوار کا دن عیسائیوں کے لئے مجازات کا دن ہونے کے سلسلہ میں اسلام میں کوئی روایت موجود نہیں ہے۔

تفصیلی جوابات

قرآن مجید نے جن داستانوں کو اہمیت دی ہے اور ائمہ اطہارؑ اور مسلمان مفسروں نے ان کی تفسیر کی ہے ان میں سے ایک داستان اصحاب سبت ہے۔

بعض یہودیوں کو کچھ نافرمانیوں کی وجہ سے سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑنے کی ممانعت کی گئی۔ انہوں نے مکر وفریب سے خداوندمتعال کے اس حکم کی نافرمانی کی، اس لئے لعن و عذاب سے دوچار ہوئے اور بندروں کی شکل میں تبدیل ہوئے۔

اصحاب سبت کی داستان قرآن مجید کے چند سوروں میں آئی ہے، من جملہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۶۵، سورہ نساء کی آیت ۴۷ و ۱۵۴، سورہ اعراف کی آیت ۱۶۳ اور سورہ نحل کی آیت ۱۲۴ میں [1]۔

حضرت امام باقرؑ کی امام علیؑ سے نقل کی گئی ایک روایت کے مطابق اصحاب سبت کی داستان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

اصحاب سبت، قوم ثمود کا ایک یہودی قبیلہ تھا، خداوندمتعال نے ان کی فرمانبرداری کا امتحان لینے کے لئے سنیچر کے دن ان پر مچھلیاں پکڑنا حرام قرار دیا تھا۔ انہوں نے اپنی نافرمانی کی توجیہ کرنے کے لئے، دریا کے اندر چھوٹے چھوٹے تالاب بنائے تھے اور مچھلیوں کے ان میں داخل ہونے کے بعد تالاب کو بند کرتے تھے اور اس طرح مچھلیوں کو دوبارہ دریا میں جانے سے روکتے تھے اور دوسرے دن انہیں پکڑتے تھے۔ ایک مدت تک یہی حالت جاری رہی اور کسی نے انہیں اس حیلہ گری اور قانون شکنی سے منع نہیں کیا، ان میں سے بعض لوگوں کو شیطان نے ذہن نشین کرایا تھا کہ خداوندمتعال نے تم لوگوں کو سنیچر کے دن مچھلی کھانے سے منع کیا ہے نہ کہ شکار کرنے سے، اس لئے وہ سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑنے کا اقدام کرتے تھے اور دوسرے دن انہیں کھاتے تھے اور اس طرح روز بروز ان کے گناہ بڑھتے گئے۔۔۔ اس کے بعد حضرتؑ نے فرمایا: لوگ ان دو گروہوں سے روبرو مقابل ہوئے۔ کچھ لوگوں نے امر بالمعروف کیا اور انہیں خداوندمتعال کی سزا سے ڈرایا اور جب دیکھا کہ ان کی نصیحت ان میں اثر نہیں کرتی ہے تو، عذاب کے خوف سے وہاں سے بھاگ گئے اور بیابانوں میں پناہ لے لی۔ لیکن کچھ لوگ باوجودیکہ ان کے کام کو ناپسند جانتے تھے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عمل نہ کرتے ہوئے وہیں پر رہے، اس لحاظ سے وہ سب عذاب الٰہی سے دوچار ہوئے اور سرانجام مچھلی پکڑنے والے مسخ ہو کر بندروں کی شکل میں تبدیل ہوگئے۔ اور امر بالمعروف نہ کرنے والے، سخت عذاب سے دوچار ہوئے، لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والوں نے نجات پائی۔۔۔ روایت کے آخر میں حضرت علیؑ نے فرمایا: قسم اس خدا کی جو ایک دانہ کو مٹی کے اندر سے پودے کی شکل میں باہر

لاتا ہے اور جس نے انسان کو پیدا کیا ہے، بیشک میں اس امت کے ان افراد کو پہچانتا ہوں جنہوں نے نہ انکار کیا اور نہ اپنے عقیدہ میں تبدیلی لائے، بلکہ انہوں نے بھی خدا کے حکم کی نافرمانی کی ہے اور دنیا میں پراگندہ ہوئے ہیں اور خداوندمتعال نے ارشاد فرمایا ہے: پس ظالم گروہ پرنفرین ہو[2] اور اسی طرح فرمایا ہے: ہم نے نہی عن المنکر کرنے والوں کونجات دیدی اور ظالموں کو بُرے عذاب سے دوچار کیا ہے، کیونکہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔[3]، [4]

اگرچہ یہ مسئلہ یہودیوں کے بارے میں ہے، لیکن آیہ شریفہ کا حکم ان تمام افراد کے لئے ہے جو خداوندمتعال کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں، یہودیوں کا یہ کام بعض سود خواروں کے مانند ہے جو بظاہر خرید وفروخت کے بہانے سے سود کے پیسوں کے مقابلے میں ایک ماچس کی ڈبیا کوفروخت کر کے اپنی سودخواری کی توجیہ کرتے ہیں اسی طرح رشوت خوار اپنے برے کام کی حق الزحمت کے عنوان سے توجیہ کرتے ہیں؛

لیکن سوال کے دوسرے حصہ کے بارے میں کہنا چاہے کہ، عیسائیوں کے اتوار کے دن سزا کے بارے میں ہمیں اسلامی کتابوں میں کوئی روایت نہیں ملی ہے۔ اس سلسلہ میں جوبعض تفسیروں میں آیا ہے وہ یوں ہے:

اکثر عیسائی سنیچر کے بارے میں کوئی خاص توجہ نہیں رکھتے ہیں، بلکہ اتوار کے دن تعطیل کرتے ہیں، کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جمعہ کے دن شہید ہوئے ہیں اور وہ تین دن کے بعد عالم ارواح سے اٹھ کر اپنے شاگردں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اس بنا پر حضرت عیسیٰؑ نے یکشنبہ کے دن قیام کیا ہے اور عیسائیوں کے لئے وہ دن مذہبی عید ہے۔

بعض عیسائی جوسبتیون (سنیچر والے) کے نام سے مشہور ہیں، یہودیوں کا جیسا اعتقاد رکھتے ہیں کہ سنیچر ایک مقدس دن ہے، اس لئے اس دن کوئی کام نہیں کرتے ہیں اور اتوار کے دن کام کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ انجیل کی آیات کے مطابق، تورات کے

دس احکام اپنی جگہ پر باقی ہیں اور حضرت عیسیٰ ان کو مکمل اور نافذ کرنے کے لئے آئے تھے[5]۔

حواشی

[1] ان آیات کی مکمل تفسیر سے آگاہ ہونے کے لئے ملاحظہ ہو: سافٹ ویر جامع تفاسیر۔ مرکز تحقیقات کمپیوٹری علوم اسلامی قم۔

[2] مؤمنون، 1.

[3] اعراف، 165.

[4] ملاحظہ ہو: قمی، علی بن ابراہیمؒ بن ہاشم، تفسیر قمی، ص 244، مؤسسۃ دار الکتاب، قم، 1404 ق.

[5] ملاحظہ ہو: بلاغی، سید عبد الحجت، حجۃ التفاسیر و بلاغ الاِکسیر، ج 2، (مقدمہ)، ص 765، انتشارات حکمت، قم، 1386 ق.

مقام ابراہیمؑ کیا ہے؟ اور اس سے مقصد و مراد کیا ہے؟

مختصر جواب

مکہ کی واضح نشانیوں میں سے ایک مقام ابراہیمؑ ہے، کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جہاں پر حضرت ابراہیمؑ کھڑے رہے ہیں۔

مقام ابراہیمؑ کے معنی اور اس کی تفسیر کے بارے میں بعض کا یہ اعتقاد ہے کہ پورا حج مقام ابراہیمؑ ہے۔ بعض کا یہ اعتقاد ہے کہ عرفات، مشعر الحرام اور تین جمرات مقام ابراہیمؑ ہے۔ بعض کا اعتقاد ہے کہ پورا حرم مکہ، مقام ابراہیمؑ شمار ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں پائی جانے والی دلیلوں اور آیہ مربوط کے ظاہر کو مدنظر رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہی معروف مقام ابراہیمؑ ہے اور وہ خانہ کعبہ کے قریب ایک نقطہ ہے، جہاں پر اس وقت ایک مخصوص پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ کے پاؤں کے نشان نمایاں ہیں۔ حجاج کرام، طواف کعبہ انجام دینے کے بعد اس (مقام ابراہیمؑ) کے پیچھے طواف کی دو رکعت نماز بجا لاتے ہیں۔

نقل کیا گیا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کعبہ کی تعمیر میں مشغول تھے، اور جب حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھ نہیں پہنچے تو انہوں نے اپنے پاؤں کے نیچے ایک پتھر رکھ لیا، اور ان کی طاقت کا بوجھ اس پتھر پر پڑا جس کے نتیجہ میں ان کے پاؤں کے نشان اس پتھر پر پڑ گئے۔ یا یہ کہ جب حضرت ابراہیمؑ اسماعیلؑ کی ملاقات کے لئے گئے تو اسماعیلؑ کی

بیوی نے ابراہیمؑ سے کہا: ذرا سر کو جھکائیے، تاکہ میں آپ کے سر اور چہرے سے گرد و غبار کو جھاڑ دوں اور اسے دھو دوں۔ ابراہیمؑ نے اپنا دایاں پاؤں آگے بڑھا دیا اور ایک پتھر پر رکھ دیا، ان کے پاؤں کے نشان اس پتھر پر باقی رہ گئے۔

البتہ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ جس طرح بھی انجام پایا ہو، حضرت ابراہیمؑ کے معجزات میں سے ہے، اس لحاظ سے اگر کوئی احتمال ہو تو وہ دور ہو جاتا ہے۔

تفصیلی جوابات

مکہ اور مسجد الحرام کے اطراف میں خدا پرستی اور توحید و معنویت کی واضح نشانیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ نشانیاں پوری تاریخ میں، دشمنوں کی طرف سے انہیں تباہ کرنے کی کوششوں کے باوجود معجزہ کے طور پر باقی رہی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ جیسے عظیم الشان پیغمبر کی بعض نشانیاں بھی باقی رہی ہیں۔ زمزم، صفا، مروہ، رکن، حطیم، حجرالاسود اور حجر اسماعیلؑ جیسی نشانیاں ماضی کی کئی صدیوں کی مجسم تاریخ ہیں۔

ان واضح نشانیوں میں سے ایک مقام ابراہیمؑ ہے۔ مقام، دو قدموں کی جگہ کو کہا جاتا ہے[1]۔ چونکہ یہ ایک ایسی جگہ ہے، جہاں پر حضرت ابراہیمؑ، کعبہ کی تعمیر کے لئے یا حج کے مراسم بجا لانے کے لئے یا لوگوں کو یہ مراسم بجا لانے کی عام دعوت دینے کے لئے کھڑے رہے ہیں، اسے مقام ابراہیمؑ کہتے ہیں۔۔۔[2]

مقام ابراہیمؑ کی تفسیر اور معنی کے بارے میں اتفاق نظر نہیں پایا جاتا ہے، بلکہ اس سلسلہ میں متفاوت اور مختلف نظریات پائے جاتے ہیں، ہم ان میں سے بعض کی طرف ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

الف) بعض افراد کا یہ اعتقاد ہے کہ اول سے آخر تک پورا حج (اس کے سارے اعمال) مقام ابراہیمؑ ہیں۔

ب) کچھ لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مقام ابراہیمؑ پورا حج نہیں ہے، بلکہ اس کے بعض اعمال جیسے: عرفات، مشعر الحرام اور تین جمرات ہیں۔

ج) بعض کا یہ اعتقاد ہے کہ پورا حرم مکہ مقام ابراہیمؑ شمار ہوتا ہے۔

د) اگرچہ مذکورہ تمام مطالب ایک طرح سے حضرت ابراہیمؑ کی جاں نثاری اور بہادری کی یادیں ہیں، لیکن اس سلسلہ میں پیش کیے جانے والے دلائل اور ظاہر آیت کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہی مشہور مقام ابراہیمؑ ہے اور وہ خانہ کعبہ کے قریب ایک ایسا نقطہ ہے جہاں پر اس وقت ایک مخصوص پتھر ہے، اور اس پتھر پر حضرت ابراہیمؑ کے پاؤں کے نشان نمایاں ہیں، اور حجاج کرام طواف بجالانے کے بعد اس کے پیچھے طواف کی نماز بجالاتے ہیں[3]۔

قابل اعتبار کتابوں میں ائمہ معصومینؑ سے بعض روایتوں میں اسی آخری قول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ہم ان میں سے بعض کو ذیل میں بیان کرتے ہیں:

کتاب کافی میں امام جعفر صادقؑ سے فیہ آیات والے جملے کے بارے میں آیا ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا: یہ آیات بینات کیا ہیں؟ امامؑ نے فرمایا: ان میں سے ایک مقام ابراہیمؑ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ وہاں پر کھڑے ہوئے اور ان کے پاؤں کے نشان پتھر پر باقی رہے، دوسرا حجر الاسود ہے اور تیسرا حجر اسماعیلؑ ہے۔[4]

ابراہیمؑ تیمی کہتے ہیں: امام صادقؑ نے مجھ سے ٹیک لگا کر فرمایا: اے ابراہیمؑ: اپنے طواف کے اجر کو جاننا چاہتے ہو؟ میں نے عرض کی: میں آپ پر قربان ہو جاؤں، جی ہاں۔ فرمایا: جو شخص معرفت کے ساتھ خانہ خدا کے پاس آئے اور سات بار طواف کرے اور مقام ابراہیمؑ پر دو رکعت نماز پڑھے، خداوند متعال دس ہزار ثواب اسے دیتا ہے اور اس کے دس ہزار درجے بڑھاتا ہے۔[5]

مذکورہ دو روایتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام ابراہیمؑ سے مراد، یہی مشہور مقام ہے جس کے پیچھے حاجی طواف کے بعد نماز طواف بجالاتے ہیں۔

فخر رازی نے اس مطلب کے استدلال میں جن دلائل سے استفادہ کیا ہے ہم ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

اول: روایت نقل کی گئی ہے کہ جب جابر نے طواف مکمل کیا تو مقام کی طرف بڑھے اور آیہ شریفہ: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ کی تلاوت کر رہے تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مقام ابراہیمؑ یہی مشہور جگہ ہے [6]۔

دوم: لوگوں کے درمیان یہ نام اسی جگہ سے مخصوص ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی اہل مکہ سے مقام ابراہیمؑ کے بارے میں پوچھے، تو اسے یہی جگہ بتائی جائے گی۔

سوم: یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کے ابراہیمؑ ایک پتھر میں دھنس گئے ہیں، یہ خدا کی وحدانیت اور حضرت ابراہیمؑ کے معجزہ کی واضح ترین دلیل ہے۔

اس بنا پر اگر ہم اس پتھر کو حضرت ابراہیمؑ سے مخصوص جانیں (یعنی مقام ابراہیمؑ سمجھیں) تو یہ اس سے بہتر ہے کہ ہم کسی دوسری جگہ کو مقام ابراہیمؑ کے عنوان سے مخصوص جانیں۔

چہارم: خداوندمتعال ارشاد فرماتا ہے کہ: مقام ابراہیمؑ سے اپنے لئے کوئی عبادت گاہ منتخب کرنا۔ حرم میں (مقام ابراہیمؑ کے نام پر مشہور جگہ کے علاوہ) عبادت سے مخصوص کوئی خاص جگہ تعلق نہیں رکھتی ہے، پس یہی جگہ مقام ابراہیمؑ ہوسکتی ہے۔

پنجم: مقام ابراہیمؑ کھڑے ہونے کی جگہ ہے اور روایتوں سے ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ (ایک قول کے مطابق) اپنے پاؤں کو دھوتے وقت اس پتھر پر کھڑے ہوئے تھے، لیکن ان کا کسی دوسری جگہ پر کھڑا ہونا ثابت نہیں ہے [7]۔

اس بنا پر، مقام ابراہیمؑ ایک ایسا پتھر ہے کہ اس پر حضرت ابراہیمؑ کے پاؤں کے نشان موجود ہیں۔ بہت سی ایسی روایتیں ملتی ہیں جو یہ دلیل پیش کرتی ہیں کہ وہ اصلی پتھر جس پر حضرت ابراہیمؑ کعبہ کی دیوار بلند کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے، اسی جگہ پر زمین کے نیچے دفن ہوگئی ہے، جو اس وقت مقام ابراہیمؑ کے کنارے پر ضلع ملتزم کے روبرو ہے[8]۔

حواشی

[1] ابنمنظور، لسانالعرب، ج12، ص498.

[2] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج3، ص 15، دار الکتب ال إسلامیۃ، تہران، 1374 ہ ش، طبع اول، با اندکی تصرف.

[3] رازی، ابوعبداللہ فخرالدین محمد بن عمر، مفاتیح الغیب، ج4، ص 44، داراحیاء التراثالعربی، طبعبیروت، 1420 ہ، طبعسوم؛ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج1، ص448، با اضافات وتغییر.

[4] کلینی، کافی، ج4، ص223، دارالکتب ال إسلامیۃ، تہران، 1365 ہ ش.

[5] حلی، ابن فہد، عدۃ الداعی، ص192، دارالکتاب ال إسلامی، 1407 ہ.

[6] مجلسی، محمد باقر، بحارالأنوار، ج21، 403، مؤسسۃ الوفاء، بیروت۔لبنان، 1404 ہ؛ صحیح مسلم(ج حدیث 147) بہ نقل از ابنکثیر دمشقی، اسماعیلبنعمرو، تفسیر القرآن العظیم، ج1، ص: 293، دارالکتبالعلمیۃ، منشوراتمحمد علیبیضون، طبعبیروت، 1419 ہ.

[7] رازی، ابوعبداللہ فخرالدین محمد بن عمر، مفاتیح الغیب، ج4، ص44.

[8] طباطبایی، محمد حسین، ترجمہ المیزان، ج3، ص 546، مترجم: موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ناشر: دفتر انتشارات اسلامی جامعۃ مدرسین حوزہ علمیہ قم، قم، 1374 ہ ش، طبع پنجم.

ایک مرد کی گواہی دو عورت کے برابر کیوں ہے؟

مختصر جواب

خداوند عالم کی جانب سے انسان کے لئے بنائے جانے والے احکام وقوانین، انسان کے وجود کی ساخت، کائنات کے حقائق اور تکوینی کے مطابق ہیں، چونکہ مرد اور عورت کے وجود کی جسمانی وروحانی ساخت مختلف ہے لہٰذا دونوں کے احکام وفرائض بھی برابر نہیں ہیں، قاضی کے پاس جاکر گواہی دینا بھی ایک فریضہ ہے حقیقت کے مطابق ہونا چاہئے اور احساسات جذبات اور دوسرے غیر واقعی اسباب کے زیر اثر نہیں ہونا چاہئے تاکہ کسی کا حق ضائع نہ ہو، اسی لئے بعض مواقع پر عورتوں کی گواہی سرے سے قبول نہیں ہوتی جیسا کہ بعض مواقع پر بنیادی طور سے مرد کی گواہی بھی قبول نہیں ہوتی اور کبھی کبھی دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی جگہ قبول ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ یہ بھی پیش نظر ہونا چاہئے کہ گواہی دینا ایک فریضہ اور ذمہ داری ہے نہ کہ ایک حق۔ لہٰذا اگر بعض افراد کی گواہی عدالت میں قبول نہیں کی جاتی یا کم قبول کی جاتی ہے تو گویا یہ ان کی ذمہ داری اور فریضہ کا آسان ہونا ہے نہ کہ ان کے حقوق کو ضائع کرنا۔

تفصیلی جوابات

چند نکات کی طرف توجہ حقیقت تک رسائی میں ہماری مدد کرسکتی ہے:

ا۔ بہت سے اسلامی حقوق اور جزاء سے متعلق مرد اور عورت میں تفاوت ہوتا ہے

مثال کے طور پر اگر کوئی مرد مرتد ہوجاتا ہےتو کچھ شرائط کے ساتھ اس کے لئے قتل کا حکم ہے لیکن اگر عورت مرتد ہوجائے تو اس کے قتل کا حکم نہیں ہے یا اسلام نے کچھ فرائض و واجبات مردوں کے ذمہ قرار دیئے ہیں جو عورت کے ذمہ نہیں ہیں یا عورتوں کے لئے کچھ فرائض مقرر کئے گئے ہیں جو مرد کے لئے مقرر نہیں ہوئے ہیں۔اس اختلاف کی وجہ مرد اور عورت کا خلقتی نظام ہے اس لئے کہ مرد اور عورت کے نفسیات و اخلاق یکساں نہیں ہیں اسی وجہ سے خداوند عالم نے عورت کو ایک کام کے لئے پیدا کیا ہےتو مرد کو دوسرے مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ دونوں ہر چند ایک ہی جنس سے ہیں لیکن ہر گز آپس میں برابر نہیں ہیں لہٰذا عدالت کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں کے فرائض و واجبات بھی یکساں نہ ہوں۔اس لئے کہ اگر یکساں ہوں گے تو یہ پروردگار عالم کی عدالت کے خلاف ہوگا۔

۲۔اسلام کی نظر میں گواہی دینا اور قاضی تک خبر پہنچانا کوئی امتیاز نہیں ہیں بلکہ ایک فریضہ اور ذمہ داری ہے یعنی دوسروں کے حقوق پائمال نہ ہونے کی خاطر اسلام نے اس فریضہ کو ان انسانوں کے ذمہ قرار دیا ہے جو لوگوں کے اختلاف کی صورت میں دقیق خبر رکھتے ہیں تا کہ قاضی کے حضور میں واقعیت اور حقیقت بیان کریں اور اس کی گواہی دیں اور اسی لئے قرآن مجید نے کتمان شہادت (گواہی نہ دینے) کی حرمت کا اعلان کیا ہے [1]

پس اگر عدالت میں کسی کی گواہی قبول نہیں کی جاتی یا بہت کم قبول کی جاتی ہے تو گویا کہ اس کی ذمہ داری اور مسؤلیت آسان اور سبک ہے نہ کی اس کا حق ضائع کیا جا رہا ہے۔

مسلم طور سے گواہی دینے کا فریضہ مرد اور عورت کی خلقت ان کے نفسیات اور کردار سے براہ راست مربوط ہے، ہر چند ایک کے نقص اور دوسرے کے کمال سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے کہ بعض موارد میں جہاں گواہی عورتوں کے مخصوص مسائل سے

مربوط ہے وہاں مردوں کی گواہی اصلاً قبول نہیں ہے اس لئے کہ ان موارد میں مرد گواہ بن ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح بعض موارد میں عورتوں کو گواہی دینے سے معاف کر دیا گیا ہے اور مردوں میں منحصر کر دیا گیا ہے اور بعض موارد میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دے کر اسے قبول کیا گیا ہے۔ یہ تمام قوانین نظام تشریع [2] کے نظام تکوینی [3] سے ہم آہنگ اور حکمت کی بنیاد پر وضع ہوئے ہیں البتہ نظام تشریع اگر نظام تکوینی فطرت کے مطابق اور اس سے ہم آہنگ نہ ہوگا تو اس کی کوئی قدر وقیمت بھی نہ ہوگی۔ نظام تشریع کی قدر وقیمت اور توانائی نظام تکوینی میں موجود ظرفیت سے مطابقت کی مقدار میں ہوئی ہے۔

نظام تکوینی میں مرد اور عورت کے درمیان چند اعتبار سے بہت زیادہ فرق موجود ہونے کی وضاحت:

ا۔ اعضاء و جوارح کے اعتبار سے: جنس مرد اور عورت کے اعضاء و جوارح مکمل طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں چاہے وہ اعضاء و جوارح جنسی اور تولید مثل کے عضو سے مربوط ہوں یا اس کے علاوہ مرد اور عورت کے بدن پر بال کا اگنا کھال کے نیچے چربی، کھال کی ضخامت، ظرفیت اور ساخت، ہڈیوں کا وزن اور اس کی شکل ہڈیوں میں موجود حیاتی مادوں کی مقدار، عضلات کا استحکام، بازو کا زور، بھیجہ کا وزن، حجم اور شکل وصورت، قلب کا وزن، نبض کی رفتار، فشار خون، حرارت بدن ایک منٹ میں سانس لینے کی تعداد، قد وقامت، وزن، آواز کا زیر و بم، ترشحات بدن، خون کے اندر سفید وسرخ ذرات کی مقدار، پھیپھڑوں کا حجم اور گنجائش اور دونوں جنسوں کا ابتداء میں جسمانی رشد ونمو خلاصہ یہ کہ مرد اور عورت کی ہر چیز یہاں تک کہ ایک بال بھی اختلاف ہے [4]۔

۲۔ خواہشات، احساسات جذبات اور اخلاق کے اعتبار سے:

اہل نفسیات کے نظریہ کے مطابق محبت انفعالی اور جذباتی کردار اور مدد کرنا عورتوں

کے خصوصیات میں سے ہے اس کے مقابلہ میں، سختی، جنگ طلبی استقلال، مقابلہ، حاکمیت اور سلطنت کو مردوں کے خصوصیات میں شمار کرتے ہیں [5] جلوہ نمائی، دل ربائی، زینت کرنا، کپڑے، سونے اور زینت کی چیزوں سے انس اور لگاؤ عورتوں کے امتیازات میں سے ہے [6]۔

عورت تقلید کرنے، فیشن اپنانے، تجمل کی طرف مائل ہونے، رونے اور ہنسنے میں مردوں سے آگے ہے [7]۔

چونکہ عورتوں کے اندر جذبات ومحبت کی توانائی زیادہ ہوتی ہے لہٰذا وہ اس قسم کے مناظر سے زیادہ متاثر ہو جاتی ہیں [8]۔

جب تکوینی میدان میں یہ خصوصتیں موجود ہیں تو تشریعی میدان میں استحکام کے لئے (خاص کو حق الناس سے مربوط) کوئی نہ کوئی چارہ سونچنا چاہیئے تا کہ گواہوں میں لوگوں کے حقوق ضائع نہ ہوں یہاں تین صورتیں قابل تصور ہیں:

الف: جذبات، پیار ومحبت کے غلبہ کی وجہ سے جو بعض جذباتی و ہیجانی امور میں عورتوں کے لئے فراموشی کا زمینہ فراہم کرتے ہیں، اسی طرح جو یہ کہا جاتا ہے کہ عورتیں ہر مسئلہ میں بہت جلد اطمینان کرلیتی ہیں اور جلدی سے یقین کرلیتی ہیں اور آسانی سے متأثر ہوجاتی ہیں لہٰذا ہمیں کہنا پڑے گا کہ عورتوں کی گواہی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے تا کہ اس گواہی کے ذریعے لوگوں کے حقوق ضائع نہ ہوں۔

یہ بات ممکن ہے دوسرے لحاظ سے دوسروں کے حقوق ضائع ہونے کا سبب بنے اور وہ ان موارد میں گواہی دینا ہے جب بات اور خبر عورتوں سے مخصوص ہو۔

ب: ہم یہ کہیں کہ تمام موارد میں عورتوں کی گواہی مردوں کی طرح اور اسی مقدار میں معتبر ہے، یہ قول اس کا باعث ہوگا کہ مذکورہ موارد کے سبب فیصلہ کا اعتبار کم ہو جائے اور

ایک طرح سے لوگوں کے حقوق ضائع ہوں۔

ج: معتدل حل: خداوند عالم جس نے انسان کو پیدا کیا اور رازوں سے باخبر ہے فرماتا ہے وہ امور جو لوگوں کے حقوق (حق الناس نہ کہ حق [اللہ]) سے مربوط ہیں ان میں عورتوں کی گواہی معتبر سمجھی جائے، لیکن استحکام کی خاطر جہاں ایک مرد گواہ ضروری ہے وہاں دو عورت اور جہاں دو مرد گواہ ضروری ہیں وہاں چار عورتوں کی گواہی کچھ شرائط کے ساتھ معتبر اور قابل قبول ہے۔

اور یہی تیسرا نظریہ اور حل جو عین عدالت اور تکوینی یعنی فطرت کے مطابق ہے اسلام نے قبول کیا ہے۔

حواشی

[1] سورۂ بقرہ 283۔

[2] تشریع نظام، یعنی وہ قوانین جو انسان کی اختیاری نقل وحرکت سے مربوط ہیں۔

[3] تکوینی نظام، یعنی وہ قوانین، وظائف اور ذمہ داریاں جو خلقت کی وجہ سے انسان پر حکم فرماں ہیں اور انسان کے اختیار سے مربوط نہیں ہیں اس میدان میں دونوں (نر اور مادہ) جنسوں کے لئے ان کے امکانات سے ہم آہنگ خاص فرائض کو مدنظر رکھا گیا ہے اس طرح کہ اس کا انکار کرنا کسی بھی فرد سے قابل قبول نہیں ہے۔

[4] پاک نژاد سید رضا، اولین دانشگاہ وآخرین پیامبران ج، 19، ص 280۔293

[5] روانشناسی رشد ج اول ص 330 از انتشارات سمت۔

[6] پاک نژاد سید رضا گزشتہ حوالہ ص 281۔

[7] گذشتہ حوالہ ص 295۔

[8] کتاب نقد، ش 12 ص 59۔

قرآن مجید کے حروف مقطعات کے کیا معنی ہیں؟

قرآن مجید کے حروف مقطعات کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خدا کے درمیان وہی رمز ہے جو انسان کے لئے نامعلوم ہے؟ ضمناً بعض محافل میں کہا جاتا ہے کہ اگر ان حروف مقطعات کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو یہ جملہ بنتا ہے صراط علی حق نمسکہ کیا یہ صحیح ہے؟

مختصر جواب

حروف مقطعات وہ حروف ہیں جو قرآن مجید کے بعض سوروں کی ابتدا میں آتے ہیں اور ان کے مستقل معنی ہیں تفسیر میں ان حروف کے بارے میں مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں کہ ان میں سے سب سے صحیح نظریہ یہ ہے کہ یہ حروف ایسے رموز ہیں جن سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیائے خدا آگاہ ہیں جملہ **صراط علی حق نمسکہ** بعض محققین کا قول ہے روایت کے لحاظ سے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے

تفصیلی جوابات

قرآن مجید کے 29 سوروں کی ابتدا میں الف باء کے حروف میں سے ایک یا چند حروف موجود ہیں، کہ مجموعاً یہ 78 حروف ہیں اور اگر تکراری حروف کو حذف کریں تو 14 حروف رہ جاتے ہیں جو حورف تہجی کے مجموعی حروف یعنی 28 کا نصف ہے ان حروف کو حروف مقطعات یا حروف نورانی کہا جاتا ہے

حروف مقطعات کے بارے میں مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں ان میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں:

1 یہ حروف اس آسمانی کتاب کے بارے میں کہ جس نے اپنی عظمت اور اہمیت کے پیش نظر تمام عرب اور غیر عرب سخن وروں کو حیرت میں ڈال دیا اور دانشوروں کو اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز کر دیا ہے اشارہ ہے کہ ان ہی حروف تہجی سے ترکیب پائی ہے جو عام لوگوں کے اختیار میں ہیں

2 حروف مقطعات قرآن مجید کے متشابہات میں سے ہیں، کہ ہرگز قابل حل نہیں ہیں اور مجہولات مطلق ہیں اور ان کو معلوم کرنے کی راہ لوگوں کے لئے مکمل طور پر مسدود ہے

3 یہ حروف، فقط حروف ہیں اور آواز کی خاصیت کے علاوہ کسی قسم کا رمز، اشارہ اور معنی نہیں رکھتے ہیں ان حروف کو بعض سوروں کی ابتدا میں لانے کا فلسفہ الفاظ اور آواز کے معنی سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور ان حروف کی آواز اس زمانہ میں قرآن مجید کی تلاوت کے دوران حضار کی توجہ جذب کرتی تھی تا کہ وہ قرآن مجید کو سن لیں، کیونکہ دشمن ہمیشہ شور وغل برپا کرنے کی کوشش کرتے تھے تا کہ قرآن مجید کی آواز راہ چلنے والے عربوں کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

4 یہ حروف اس سورہ میں زیادہ استعمال ہونے کی علامت ہے، اور یہ ایک معجزہ ہے بدرالدین رزکشی کہتے ہیں: ان حروف کا ایک دقیق راز یہ ہے کہ جس سورہ کی ابتدا میں یہ حروف واقع ہو اس سورہ کے اکثر الفاظ انہی حروف سے تشکیل پاتے ہیں مثلاً حرف ق، سورہ ق اور سورہ حم عسق میں ہر سورہ میں 57 بار تکرار ہوا ہے ایک مصری دانشور نے اس نظریہ کی بیناد پر کمپیوٹر کے ذریعہ ایک پیچیدہ محاسبہ انجام دیا ہے اور اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ یہ حروف اس سورہ میں زیادہ استعمال ہونے کی علامت ہیں اور یہ بذات خود ایک معجزہ ہے

5 یہ حروف قسم کھانے کے لئے استعمال ہوئے ہیں ان حروف کی قسم کھانا اس وجہ

سے ہے کہ تمام زبانوں میں اصل کلام ان ہی حروف کی بنیاد پر ہے

6 ان حروف اور ان سے مربوط سوروں کے درمیان ایک رابطہ پایا جاتا ہے، کیونکہ مشابہ حروف مقطعات سے شروع ہوئے سوروں میں غور وفکر اور تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورے محتویٰ کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں [1]

7 بعض حروف مقطعات اسمائے حسنائے الٰہی کے کسی اسم اعظم کی علامت اور اشارہ ہیں اور ان میں سے بعض پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم مبارک کی طرف اشارہ اور رمز ہیں، خدا کے ناموں میں سے ہر ایک نام چند حروف پر مشتمل ہے اور ہر نام سے ایک منتخب شدہ حرف غیر مربوط صورت میں قرآن مجید کی بعض سوروں کی ابتدا میں قرأت کیا جاتا ہے جو ہر یہ سفیان ثوری سے روایت کرتا ہے کہ: جعفر بن محمد بن علی بن الحسینؑ سے عرض کی گئی: اے فرزند رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! خداوند متعال کی کتاب میں جو فرمایا گیا ہے کہ: الم وغیرہ ان کلمات کے کیا معنی ہیں؟

امام صادق علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: سورہ بقرہ کی ابتدا میں الم کے معنی انا اللہ الملک ہیں لیکن سورہ آل عمران کی ابتدا میں موجود الم کے معنی انا اللہ المجید ہیں اور

8 یہ حروف اسم اعظم الٰہی کے اجزاء ہیں

9 یہ حروف سورہ میں موجود آیتوں کی تعداد کی طرف اشارہ ہے

10 ہر سورہ کے حروف مقطعات، اس سورہ کا نام ہے، چنانچہ سورہ یٰسین، طٰہٰ، ص میں سے ہر ایک اپنے حروف مقطعات سے موسوم ہوئے ہیں

11 یہ حروف امت اسلامیہ کی بقاء کی مدت کی طرف اشارہ ہیں

12 یہ حروف سوروں کے درمیان فاصلہ اور پہلے والے سورہ کے ختم ہونے اور دوسرا سورہ شروع ہونے کی علامت ہیں

13 یہ حروف سورہ کے محتوی اور پیغام کا خلاصہ ہیں

14 یہ حروف ان افراد کے ناموں کی طرف اشارہ ہیں، جن کے پاس قرآن مجید کے کچھ نسخے موجود تھے، مثلاً س، سعد بن ابی وقاص کی طرف اشارہ ہے [2]

15 یہ حروف خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان رموز ہیں، ان کے بارے میں کسی کو آگاہی حاصل نہیں ہے آزاد محققین کا نظریہ یہی ہے [3]

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: الم، خداوندمتعال اور اس کے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان ایک اشارہ ہے، خدا کا ارادہ ہے کہ کوئی اور اس سے آگاہ نہ ہو جائے اس لئے اس کو حروف کی صورت میں بیان کیا ہے تا کہ ان رموز کو غیروں سے پوشیدہ رکھے اور صرف اپنے دوست پر واضح اور ظاہر کرے [4]

حروف مقطعات کو ایک دوسرے کے ساتھ مرتب کرنے کے نتیجہ میں متعدد عبارتیں تشکیل پائی ہیں کہ اہل فکر افراد نے اپنے اعتقادات اور ذوق وسلیقہ کے مطابق ان حروف سے استفادہ کرکے اپنی پسند کے مطالب کو اخذ کیا ہے، مثال کے طور پر بدرالدین زرکشی کہتے ہیں: ان حروف کی ترکیب سے یہ جملہ بنایا جاسکتا ہے: تصر حکیم فاطع له سر اور فیض کا شانی نے یہ جملہ بنایا ہے: صراط علی حق نمسکه (راہ علیؑ راہ حق ہے ہم اس سے تمسک کرتے ہیں)[5] وغیرہ لیکن روایات کے لحاظ سے ان جملات کی کوئی بنیاد نہیں ہے

حواشی

[1] المیز ان، ذیل آیہ 6 سورہ شوری

[2] مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: مقالہ حروف مقطہ، سایٹ فرہنگ و معارف قرآنی.

[3] معرفت ہادی، علوم قرنی، ص 138.

[4] ابن طاوس، سعد السعو د، ص 217، طبع نجف.

[5] تفسیر الصافی، ج1، ص 91.

قرآن مجید میں کتاب مبین اور رطب و یابس (خشک وتر) کا مراد کیا ہے؟

مختصر جواب

قرآن مجید میں کتاب مبین علم الٰہی کا ایک مرحلہ ہے جو افعال الٰہی کے صادر ہونے کا سبب ہوتا ہے اور تخلیق سے پہلے اور اس کے دوران اور اس کے بعد موجود ہوتا ہے اور ہر مخلوق کی پیدائش سے پہلے والے مراحل اور ان پر حوادث کے تحولات اور ان کے عدم کے بعد آثار کو درج کر کے انہیں تحفظ بخشتا ہے۔ لہٰذا اس کو دوسرے عناوین جیسے لوح محفوظ، ام الکتاب، امام مبین اور کتاب حفیظ سے بھی یاد کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک عنوان ایک خاص اعتبار سے اس پر لاگو ہوتا ہے۔

اس لئے اگر چہ، بعض دوسری آیات میں یہ، لفظ وحی اور نزول وغیرہ کے ہمراہ ہے۔ لیکن کتاب مبین یہی قرآن مجید ہے۔ البتہ اس آیہ کریمہ (انعام۔ ۵۹) اور اس کے مانند دوسری آیات میں، اس سے قرآن مجید، مراد نہیں ہے، اگر چہ قرآن مجید بھی اس جگہ پر معنی لئے گئے ہیں۔

رطب و یابس (خشک وتر) دو متناقض چیزیں ہیں، کہ تمام مخلوقات ایک صورت میں ان دو میں سے ایک کے تحت درج ہیں، اس لئے یہ تعبیر تمام موجودات کے بارے میں کنایہ

ہوسکتی ہے، پس آیہ کریمہ تمام مخلوقات، کی پیدائش سے پہلے، پیدائش کے بعد حتی کہ ان کی ظاہری نابودی کی نسبت علم الٰہی کی عمومیت بیان کرتی ہے اس لئے رطب و یابس (خشک وتر) کسی خاص مخلوق کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

تفصیلی جوابات

یہ آیت علم الٰہی کے مراحل اور اس کی عمومیت کے بارے میں ایک اشارہ ہے۔ جبکہ علم الٰہی اور اس کے مراحل، اسلامی محققین کے درمیان پیچیدہ ترین، ہنگامہ بر پا کرنے والے اور اختلافات سے بھرے اعتقادی مسائل ہیں، اس حد تک کہ بعض اقوال کے درمیان جمع انتہائی مشکل ہے۔ اس لئے ملا صدرا اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: علم الٰہی کی معرفت حاصل کرنا انسان کے عالی ترین کمالات میں سے ہے اور ان کو حاصل کرنا انسان کے لئے مقدسین سے آگے بڑھنے کا سبب بن جاتا ہے۔ بلکہ اسے تمام ملائکہ مقربین سے بھی آگے لے جاتا ہے، لیکن ان کو سمجھنا اور اس کا ادراک کرنا اس قدر پیچیدہ اور مشکل ہے کہ اس میدان میں بوعلی سینا اور شیخ اشراقی جیسے بہت سے علماء کے قدم بھی ڈگمگائے ہیں۔ جب ان دو شخصیتوں کے فلسفہ میں اس قدر ہوش و ذکاوت اور تبحر ہونے کے باوجود ایسی حالت ہے، تو دوسروں کی کیا حالت ہوگی، جو نفسانی خواہشات، اور بدعتوں سے دو چار ہوتے ہیں یا علم کلام اور گفتگو میں جنگ و جدل کرنے والے ہوتے ہیں؟! بیشک ایسے لوگ بدترین گمراہی سے دو چار ہوئے ہیں اور انہوں نے بدترین نقصان اٹھایا ہے۔...[1] اس لئے علم الٰہی کی کیفیت اور اس کے مراحل کے بارے میں مشکل سے ہی کوئی صحیح اور مناسب نظریہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ پس یہاں پر اپنی بے بسی کا اعتراف کرنا چاہئے اور ذات وصفات الٰہی کی حقیقت کو پانے کے سلسلہ میں اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے اس میں بے جا غور وخوض کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے! بہرحال محققین اور تجسس کرنے والوں کے کلام سے استفادہ کرتے

ہوئے علم الٰہی کو مندرجہ ذیل مراتب اور مراحل میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ذات، صفات ذاتیہ اور اسمائے ذاتیہ کا علم: (یہ وہ مقام غیب الغیوب ہے کہ جو کسی بھی انسان کے لئے مشہود نہیں ہوتا ہے)

۲۔ اقتضائے ذات کے مطابق علم ذات: اسے تخلیق سے پہلے مخلوقات کے بارے میں کلی اور اجمالی علم کہا جاتا ہے۔ (اجمالی اس معنی میں کہ ابھی ان کی حد و مقدار معین نہیں ہوئی ہے اور ایک دوسرے سے متمائز نہیں ہیں)

۳۔ مخلوقات کے بارے میں تخلیق سے پہلے تفصیلی علم، تخلیق کی ابتدا سے قیامت کبری تک جاری رہنے کا تفصیلی علم (تفصیلی اس معنی میں کہ مخلوقات کی حد و مقدار معلوم ہے اور مراحل پیدائش اور اس میں تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔)

٤۔ وہ مخصوص علم جو فعل کے صادر ہونے اور اس کے محقق ہونے کا سبب بن جاتا ہے اور یہ علم بذات خود فعل کے پیدا ہونے کا منشا ہوتا ہے (علم عنایی)

٥۔ خلق ہوئی مخلوقات، ان کے تمام تحولات اور تصورات، ان کے ثبت وضبط کا علم۔ اس طرح کہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رہیں۔ اس پر کبھی بھول چوک اور سہو وخطا اور نابودی عارض نہیں ہوتی ہے۔

٦۔ انسان کے حالات، اعمال اور افکار کا اندراج جو ممکن ہے کفر کے بعد ایمان یا گناہ کے بعد توبہ کے سبب محو ونابود ہو جائیں اور یا اس کے برعکس ایمان کے بعد کفر یا اطاعت کے بعد گناہ و بغاوت کے سبب نیست و نابود ہو جائیں۔ اس کے علاوہ انسان کے مرنے سے اس کے ریکارڈ کی فائل بند ہو جاتی ہے مگر یہ کہ سنت حسنہ وسنت سیئہ ہو اس صورت میں اس کے بعد بھی اس کا اثر باقی رہتا ہے۔ چنانچہ تمام مخلوقات کے تبدل اور انفعال کے بعد ان کی وجودی فائل بند ہوتی ہے اور محافظ خانہ میں محفوظ رہتی ہے، اس لئے اس میں کسی قسم کا

شک وشبہ نہیں ہے کہ ہر مرحلہ اپنے پہلے مرحلہ سے نشات پا تا ہے اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔اور یہ سب مراحل، خداوند متعال کے تمام مخلوقات پر اس کے وجودی اور قیومی تسلط اور ان کے تاثیر واثرات کے علاوہ کچھ نہیں ہیں، بغیر اس کے کہ علوم میں وسائل اور آلات کا محتاج ہو یا یہ کہ کسی موقع پر اپنے آپ کو اس احاطہ سے باہر نکال لے اور معلوم حق واقع نہ ہو جائے۔اس لحاظ سے یہ اعتبارات اور مرحلہ بندیاں، تعلیم وتعلم کے مقام پر تعبیر کی تنگی اور محدودیت کی وجہ سے پیش کی جاتی ہیں تا کہ انسان متوجہ ہو جائے کہ اس کے وجود، افکار وحالات اور کردار پر خداوند متعال کی نظر ہے اور سب کچھ مو بمو درج ہوتا ہے اور کل قیامت کے دن اس کے نامہ عمل کی صورت میں اسے پیش کیا جائے گا، تا کہ اس نظارت کے پیش نظر اپنی کارکردگی کا خیال رکھے اور الٰہی تربیت حاصل کرے اور خلیفہ اللہ کے مقام پر فائز ہو جائے۔

بہر حال اسلامی فلسفہ کی نظر میں پہلی اور دوسری قسم، صفات ذاتی محسوب ہوتی ہیں اور عین ذات ہیں اور ہر قسم کے تغییر وتحول سے محفوظ ہیں۔اور باقی اقسام، صفات فعلیہ اور علم فعلی کے مرحلہ میں شمار ہوتی ہیں جو مخلوقات کے عینی تحقق میں دخیل ہیں اور ان کے تغیرات و تبدلات سے متاثر ہو کر مختلف قسموں میں منقسم اور متغیر ہوتے ہیں۔[2]

چونکہ علم الٰہی، تمام مراحل میں، شہودی اور حضوری اور خداوند متعال کے وجودی اور قیومی تسلط سے نشات پاتا ہے، اس لئے علم فعلی کا متغیر، منفعل اور متاثر ہونا ذات الٰہی میں انفعال وتغیر کا سبب نہیں بنتا ہے۔[3] کیونکہ تغیر علم کے نتیجہ میں ذات کا انفعال، انسان جیسی مخلوق سے مربوط ہے کہ اس کے علوم حضوری وشہودی کے بجائے اکثر حصولی ہوتے ہیں! لیکن یہ آیہ کریمہ (سورہ انعام۔ ۵۹) فرماتی ہے: اور اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں جنہیں اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے اور وہ خشک وتر سب کا جاننے والا ہے۔کوئی پتہ بھی گرتا ہے تو اسے اس کا علم ہے۔زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ یا کوئی خشک وتر ایسا نہیں

ہے جو کتاب مبین کے اندر محفوظ نہ ہو۔

آیت کا پہلا حصہ: یعنی اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے ۔علم الٰہی کی پہلی دو قسموں کی طرف اشارہ ہے، یعنی علم ذاتی، کہ اس کے علاوہ کوئی اس سے آگاہ نہیں ہے اور کسی کے پاس اسے ادراک کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ چنانچہ سورہ حجر کی آیت نمبر ۲۱ اوراس کی مشابہ دوسری ٦ آیات [4] میں خزائن کی یہی علم ذاتی تفسیر کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے غیب کے خزانوں، سے مراد وہی مرحلہ ذات میں مقتضیات ذات ہے۔

لیکن آیت کا دوسرا حصہ تخلیق کے بعد اللہ کے علم فعلی کی طرف اشارہ ہے۔ تمام موجودات کی عمومیت کے لحاظ سے فرماتا ہے: خدا صحرا و دریا میں موجود ہر چیز کا جاننے والا ہے، اس کی تاکید فرمانے کے لئے، زمین وآسمان میں مخفی چھوٹے دانہ اور پتہ کے گرنے کی مثال پیش کرتا ہے، کہ وہ بھی خدا کے علم سے مخفی نہیں ہے ۔ چنانچہ سورہ سباء کی آیت نمبر ۳ میں فرماتا ہے: وہ عالم الغیب ہے اس کے علم سے آسمان وزمین کا کوئی ذرہ دور نہیں ہے اور نہ اس سے چھوٹا اور نہ بڑا بلکہ سب کچھ اس کی روشن کتاب میں محفوظ ہے۔ [5]

رطب و یابس (خشک وتر) دو نقیض ہیں ۔یعنی بالآخر ہر مخلوق ان دو میں سے کسی ایک کے تحت آتی ہے اور ایک مخلوق ایک ہی وقت میں دونوں کے لئے مصداق نہیں ہوسکتی ہے ۔ پس اس آیہ کریمہ میں خشک وتر کے درمیان جمع تمام مخلوقات کے بارے میں کنایہ ہے۔ دوسری جانب چونکہ ایک مخلوق کبھی تر اور کبھی خشک ہوسکتی ہے، اس لئے اس تعبیر کو عالم مادہ میں پیدا ہونے والے تمام تحولات اور تغیرات کے بارے میں علم الٰہی کی طرف کنایہ کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

مبین کے معنی واضح وآشکار اور کسی قسم کے شک وشبہ وابہام کے بغیر ہونا ہیں ۔

ملاصدرا رحمۃ اللہ علیہ کتاب کی تعریف میں لکھتے ہیں: کتاب کو بیشک اس لئے کتاب کہا جاتا ہے کہ اس کے بعض حروف اور الفاظ آپس میں ضمیمہ ہوتے ہیں لفظ کتاب کو کتبہ الجیش سے لیا گیا ہے۔ یعنی سپاہیوں کی آپس میں جمع ہوئی ایک جماعت۔[6]

علم کے اس مقام کی تعریف میں وہ لکھتے ہیں: حقیقت یہ ہے کہ ذات کے مرحلہ میں، وہی اشیاء کے بارے میں علم الٰہی ہے۔ یہ وہ علم ہے جو امکان وترکیب کی ملاوٹ سے پاک ومنزہ ہے اور اس صورت میں ہے کہ خداوند متعال کے لئے عالم امکان میں موجود تمام مخلوقات مکمل صورت میں واضح اور منکشف ہیں اور یہی امر ان کے خارج میں تخلیق ہونے کا سبب بن جاتا ہے جو اس کے لئے قصد رویت کا محتاج نہیں ہے اور یہ ایک ایسا بسیط علم ہے جو واجب لذاتہ اور قائم بذاتہ ہے اور دوسرے تفصیلی اور نفسی علوم کا خالق ہے، اس بنا پر یہ علم خدا کی طرف سے ہے (اور اس کی ذات سے اہمیت پاچکا ہے) نہ یہ کہ خدا کی ذات کے اندر واقع ہو۔[7]

ملاصدرا کی وضاحتیں سورہ رعد کی آیت نمبر ۳۹ کی ذیل میں آئی ہیں، اس کے مشابہ تفصیل سورہ زخرف کی آیت نمبر ۱ سے ٤ تک بھی آئی ہے، لیکن ام الکتاب، لفظ باقی و عندہ کے ہمراہ ہے، اس کے علاوہ تمام مخلوقات کی تفصیلات ان کی حد ومقدار کا ان کی ذات کی عدم ترکیب سے، جس کی اس نے نفی کی ہے، تطابق سے۔ اس کے علاوہ جو وہ تاکید کرتے ہیں کہ علم ذاتی عنہ ہے نہ کہ منافات رکھتا ہے۔

پس یہ کتاب مبین، ام الکتاب، لوح محفوظ، لوح محو واثبات، امام مبین اور ان کے مانند تعبیرات، اس عین ذات کے علم ذاتی کی طرف اشارہ نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ملاصدراؒ کی توضیحات کے مطابق وہ علم، امکان، ترکیب، حد اور مقدار کی ملاوٹ سے پاک ومنزہ ہونا چاہئے اور ہمیشہ عنہ کی تعبیر کے ساتھ ہوتا ہے اور تعبیر فی کے ہمراہ نہیں ہونی چاہئے، جبکہ ان

آیات میں مخلوقات کی تفصیلات کی طرف اشارہ ہوا ہے، حتی کہ کے گرنے، اور مخلوقات کے خشک وتر ہونے تک کا اشارہ ہوا ہے! اور یہ تعبیر یں عندہ اور فی کے ہمراہ ہیں۔

اس لئے، اس سلسلہ میں علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ کی وضاحتیں زیادہ فکر خیز ہیں۔

چونکہ غیبی خزانے اور کتاب مبین دونوں تمام مخلوقات کو شامل ہیں، ان میں تفاوت نہیں ہے اور لہٰذا کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جس کے لئے خدا کے پاس ایک خزانہ نہ ہو، جس سے وہ مدد حاصل کرے، اسی طرح کوئی ایسی مخلوق نہیں ہے جس کو کتاب مبین نے اس کی تخلیق سے پہلے، تخلیق کے دوران اور اس کے بعد درج کر کے اس کا حساب و کتاب نہ کیا ہو، صرف کتاب مبین کا درجہ غیب کے خزانوں کی بہ نسبت پست تر ہے، یہاں پر ہر دانشور و مفکر کے لئے یہ معنی واضح ہوتے ہیں کہ کتاب مبین صرف ایک کتاب ہونے کے باوجود (اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کے ساتھ ملا ہوا ہے) صرف ایک (سادہ) کاغذ اور لوح نہیں ہے۔ مادی اوراق جس قدر بھی بڑے ہوں اور جس طرح بھی ان کے بارے میں فرض کیا جائے، (تمام مخلوقات اور حوادث کے درج کرنے کی) گنجائش نہیں رکھتے ہیں۔[8] کتاب مبین سے مراد ایک ایسا امر ہے کہ مخلوقات کے ساتھ جس کی نسبت عمل کے پروگرام کے خود عمل کے مانند ہے۔ اور اس کتاب میں ہر مخلوق کا ایک اندازہ و مقدار ہے، صرف یہ کہ خود یہ کتاب ایک ایسی مخلوق ہے جو ہر مخلوق سے پہلے، ہر مخلوق کے خلق ہونے کی حالت میں اور اس کے فنا ہونے کی حالت میں اور اس کے فنا ہونے کے بعد بھی موجود تھی اور موجود رہے گی۔

یہ ایک ایسی مخلوق ہے، جو خداوند متعال کے اشیاء کے علم پر مشتمل ہے۔ وہ علم جس میں بھول چوک اور حساب کو گم کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔[9] مختصر یہ کہ یہ کتاب، ایک ایسی کتاب ہے، جس میں کائنات کی تمام مخلوقات کی گنتی کی گئی ہے اور جو کچھ تھا اور ہے اور ہوگا اس سب کا ایسے حساب کیا گیا ہے کہ اس میں چھوٹی سی چھوٹی مخلوق بھی درج ہوئے بغیر نہیں

رہی ہے۔[10]

خداوند متعال کے کلام میں اس کتاب کے مختلف نام ہیں، ان میں سے ایک لوح محفوظ یا کتاب حفیظ ہے۔ ان میں سے دوسرا نام ام الکتاب اور تیسرا کتاب مبین اور چوتھا نام امام مبین ہے کہ ان چار ناموں میں سے ہر نام کے ساتھ ایک مخصوص عنایت ہے اور ممکن ہے ان میں امام مبین کی عنایت اس لئے ہو کہ خداوند متعال کے قطعی قضا وقدر پر مشتمل ہے...اور سورہ جاثیہ آیت ۲۹ کی تفسیر کے مطابق نامہ اعمال بھی، اس کتاب سے سے لیا جاتا ہے...[11] لوح محفوظ اس لئے ہے کہ جو کچھ تھا، ہے اور قیامت تک ہوگا اس کتاب میں محفوظ ہے (اور نابود ہونے والا نہیں ہے)[12] لوح محفوظ کو اس لئے ام الکتاب کہا جاتا ہے کہ ہر آسمانی کتاب اس سے لی جاتی ہے[13] اور اسے کتاب مکنون اس لئے کہا جاتا ہے کہ انسانی عقول کی رسائی سے بلند تر ہے اور انسانی عقلوں سے مخفی ہے۔ اور اسی کتاب میں درج ہے کہ کبھی صدور وتخلیق کا طریقہ اور تحقق امور کو محو یا مستحکم کیا جاتا ہے یا اس کے اپنے اختیار سے راہ وروش میں تبدیلی کے نتیجہ میں اعمال پر احاطہ کرنا یا انہیں تکفیر کرنا اس امر کا سبب بن جاتا ہے کہ سرانجام اس کا نامہ اعمال اس کی انتہائی تلاش کے مطابق حاصل ہوکر قیامت کے دن اس کے حوالہ کیا جائے، اگرچہ اس کتاب میں قطعی قضا وقدر ہر گز قابل محو و اثبات نہیں ہوں گے، جیسے گزشتہ امتوں اور مومن و گناہ گار انسانوں اور آسمان و زمین اور انسان کی تخلیق کے مراحل اور مستقبل میں الٰہی وعدوں کا پورا ہونا اور آفاقی عدل و انصاف اور قیامت کا برپا ہونا وغیرہ...

مذکورہ مطالب سے واضح ہوا کہ ان آیات کریمہ میں کتاب مبین سے مراد یہ عربی الفاظ پر مشتمل مکتوب قرآن مجید نہیں ہے، بلکہ یہ قرآن مجید اور اس کے نزول پر رونما ہوئے تدریجی مراحل اور حوادث اور جو کچھ اس پر مستقبل میں گزرے گا، سب کے سب کتاب مبین

عندرب کا ایک حصہ ہے نہ کہ مکمل۔ یہ قرآن مجید اس وقت ہمارے ہاتھ میں ہے اور ہم اس سے استفادہ کرتے ہیں، لیکن وہ کتاب مبین انسان کی پہنچ سے خارج ہے اور اس سے انبیاء اوصیا اور اولیا کی معلومات، خداوند متعال کی اجازت اور اس کے اعلان پر منحصر ہے نہ کہ اس سے زیادہ۔[14]

لیکن بعض دوسری آیات میں، جیسے سورہ قصص۔۲، سورہ شعراء۔۲، سورہ نمل۔۱، سورہ حجر۔۱، سورہ یوسف۔۱ اور سورہ مائدہ۔۱۵ میں کتاب مبین کے ساتھ، وحی و نزول جیسی تعبیروں کا قرینہ بیان ہونے کے سبب اس سے مراد موجودہ قرآن مجید ہے، جو ہر ایک کے لئے قابل فہم و ہدایت ہے۔

پس قرآن مجید میں کتاب مبین کا دو طریقے سے استعمال ہوا ہے: ایک مخلوقات کی تخلیق سے پہلے، تخلیق کے دوران اور تخلیق کے بعد خداوند متعال کے تفصیلی علم فعلی کی تجلی گاہ۔ اور دوسرا خود قرآن مجید، جو عربی زبان میں الفاظ پر مشتمل ہے جو اس علمی مرکز سے استخراج ہو کر محقق ہوا ہے اور ان دونوں کی کارکردگی کو آپس میں مخلوط نہیں کیا جانا چاہئے۔

ایک اور اشارہ یہ کہ رطب و یابس (خشک و تر) کے لئے حدیث کی کتابوں میں بعض مصادیق ذکر ہوئے ہیں، جو سب مثال کے طور پر ہیں۔ مثلاً: ساقط ہوئے جنین کو یابس (خشک) کا مصداق اور نوزاد بچہ کو رطب (تر) کے لئے یا کٹی ہوئی فصل کو یابس (خشک) کے لئے اور کھڑی فصل کو رطب (تر) کے مصداق کے طور پر پہنچوایا گیا ہے۔ لیکن ظہور سیاق آیت، علم الٰہی کی عالم ہستی کی تمام مخلوقات پر عمومیت اور ان میں تحولات و ترقی پر دلالت ہے۔[15]

مذکورہ وضاحتوں کے پیش نظر مزید تین امر قابل احتمال ہیں:

۱۔ اولیائے الٰہی جیسے ابراہیمؑ علیہ السلام کو دکھائے جانے والے [16] ملکوت، آسمان اور

زمین اور حتی کہ عالم بالا میں معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم [17] کی مراد اسی مخلوق سے مربوط ہے جسے کتاب مبین کہا جاتا ہے۔

۲۔معصومین علیہم السلام کا علم غیب اسی کتاب مبین سے استفادہ کیاجاتا ہے اور اسی جگہ سے ان کے لئے اس علم کا اضافہ ہوتا ہے۔لیکن بعض لوگوں کوعلم الکتاب[18] عطا کیا جاتا ہے اور وہ صاحب ولایت کلیہ الٰہی بن جاتے ہیں اور بعض لوگوں کوعلم من الکتاب[19] عطا کیا جاتا ہے اور وہ اس ولایت سے کسی حد تک بہرہ مند ہوتے ہیں۔

۳۔ممکن ہے عرش اور اس پر تسلط بھی یہی مخلوق (کتاب مبین) اور یہی مقام ہو۔ لہٰذا عرش پر استوا، کتاب مبین میں موجود مضبوط علم الٰہی کے مطابق عالم ہستی کی تخلیق کے تدبیر کے لئے کنایہ ہے۔[20]

منابع و ماخذ:

۱۔امین، سید مہدی، معارف قرآن در المیز ان، ج ۷ و ۱۰ و۱۱ و ۱۷ و ۱۸، سازمان تبلیغات اسلامی، طبع اول، ۱۳۷۰، تہران۔

۲۔شیرازی، صدر الدین محمد، الحکمہ المتعالیہ، ج۶،ص۱۱۸۔۱۱۰ وص۱۴۹و ص۳۰۶، ج۲،ص۳۱۱۔۲۹۹، درالحیاء الترث العربی، طبع چہارم، ۱۴۱۰ھ ق، بیروت۔

۳۔طباطبائی، محمد حسین، المیز ان، دفتر انتشارات اسلامی قم۔

۴۔طبرسی، ابی علی فضل بن حسن، مجمع البیان، ج۲، مکتبہ العلمیہ الاسلامیہ، تہران ص ۳۱۱۔

۵۔طیب، سید عبدالحسین، اطیب البیان، کتابفروشی اسلامی، طبع دوم، تہران ص ۹۱۔۹۲۔

۶۔قمی مشہدی، محمد بن محمد رضا، کنز الدقایق، ج۴، ص ۳۴۴۔۳۴۲، مؤسسہ طبو

ونشر (وزارت ارشاد)، طبع اول ١٤١١ھ ق، تہران۔

٧۔ مصباح یزدی، محمد تقی، معارف قرآن، ج١۔ ٣، مؤسسہ درراہ حق، طبع دوم، ١٣٦٨، وم۔

٨۔ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج٨ و٩ و١٥ و ١٨، دار الکتب الاسلامیہ، طبع ١٧، ١٣٧٤، تہران۔

حواشی

[1]۔شیرازی، صدرالدین، محمد، الحکمہ المتاعالیہ، ج٦، ص١٧٩۔ ١٨٠

[2]۔ ملاحظہ ہو: علامہ ی حلی، باب حادیعشر، فصل نفی الحوادث عنہ وسایر کتب کلامی و فلسفی، بحث علم الاہی۔

[3]۔ ایضا۔

[4] سورہ انعام، ١٠، سورہ ہود، ٣١، سورہ اسرا،، ١٠٠، ص٩، سورہ طور، ٣٧، سورہ منافقون، ٧ ملاحظہ ہو: ج١٣، ص٢٠١۔ ١٩٦۔

[5]۔ و نیز یونس، ٦١۔

[6]۔شیرازی، صدرالدین محمد، حکمت متعالیہ،، ج٦، ص٢٨٩۔

[7]۔شیرازی، صدرالدین محمد، حکمت متعالیہ، ج٦، ص٢٨٩۔

[8]۔ امین، سید مہدی، معارف قرآن در المیز ان، ص٢٢٥۔ ٢٢٤، نقل از المیز ان، ذیل آیہ ٥٩ سورہ انعام و نیز ہمان، ص٢٢٩، اذ المیز ان، ذیل آیہ اسراء، ٥٨۔

[9]۔۔ امین، سید مہدی، معارف قرآن در المیز ان، ص٢٢٥۔ ٢٢٤، نقل از المیز ان، ذیل آیہ ٥٩ سورہ انعام و نیز ہمان، ص٢٢٩، اذ المیز ان، ذیل آیہ اسراء، ٥٨۔

[10]۔امین، سید مہدی، معارف قرآن در المیز ان، ص٢٢٥۔ ٢٢٤، نقل از المیز ان، ذیل آیہ ٥٩ سورہ انعام و نیز ہمان، ص ٢٢٩، ذیل آیہ اسراء، ٥٨۔

[11]۔ ایضا، ص٢٢٦۔

[12]۔ ایضا، ص٢٣٠، از المیز ان، ذیل ق، ٤۔

[13]۔ایضا،ص ۲۲۳ ،اذ المیز ان،ذیل ذخرف،۱۔٤۔

[14]۔سورہ انعام،۵۰ ،سورہ ہود،۳۱۔

[15]۔ملاحظہ ہو:المیز ان ج ۷ ،ص ۲۱۲ ، کنزالدقایق،ج ٤ ،ص ۳٤٤۔۳٤۲۔

[16]۔سورہ انعام،۷۵ ،سورہ مومنون،۸۸۔

[17]۔سورہ اسراء،۱ سورہ نجم،۱۔۱۸۔

[18]۔سورہ رعد،٤۳۔

[19]۔نمل،٤۰ ملاحظہ ہو:علم امام علی علیہ السلام،سوال ۱٦۵۔

[20]۔امین،سید مہدی، معارف قرآن در المیز ان،ص ۱۸٤۔۱۷۷، المیز ان ذیل آیات: معارج، ٤ ، خرف،۸۲ ،مومن ۱۵ و ۷ ، اعراف، ۵٤ ،

حاقہ،۱۷،حدید،٤۔

قرآن مجید میں خداوند عالم کے حیلہ سے کیا مراد ہے؟

مختصر جواب:

کسی اچھے یا برے کام کے لئے چارہ جوئی یا تدبیر کو حیلہ کہتے ہیں۔اسی لئے قرآن میں بھی حیلہ دوہرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بہت سے آیتوں میں مکر (حیلہ) کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے جس سے مراد خداوند عالم کی مجموعی تدبیر ہے۔چونکہ وہ تمام تدبیروں کا مالک ہے۔کوئی بھی تدبیر اس کی تدبیر کے دائرہ سے باہر نہیں ہے لہٰذا خداوند عالم ہر مدبّر سے بالا و برتر ہے کیونکہ واللہ خیرالماکرین۔ اور خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:اس سے پہلے بھی لوگوں نے تدبیریں کی، منصوبے بنائے لیکن تمام تدبیریں،تمام منصوبے خدا کے ہیں،وہ ہر کس کے افعال سے آگاہ ہے اور جلد ہی کفار کو پتہ چل جائے گا کہ اس دنیا کا نیک انجام کس کے ہاتھ میں ہے۔اس آیت میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ تمام تدبیریں خداوند عالم کے قبضہ قدرت میں ہے خداوند عالم کی تدبیر کے مقابلے میں دوسروں کی تدبیریں کسی کام کی نہیں ہے۔

تفصیلی جوابات

لغت میں مکراور حیلہ کا مطلب،تدبیر اور چارہ جوئی ہے،چاہے وہ تدبیر نیک کام کے لئے ہو یا برے کام کے لئے [1]؛ چاہے خود وہ تدبیر نیک ہو یا شر۔اگر چہ بعض لوگ مکر کو فریب دینے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں لیکن جب خدا کی طرف نسبت دی جاتے تو یہ

لفظ فریب ومکاری کے توڑ اور عذاب دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔[2]

ان تمام آیتوں کو دیکھنے کے بعد جس میں لفظ مکر آیا ہے[3] یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مکر الٰہی (خدائی حیلہ) سے مراد وہی تدبیرو چارہ جوئی ہے،البتہ کبھی رحمت کی صورت میں ہے تو کبھی عذاب کی شکل میں ؛مثال کے طور پر **یَمکُرونَ و یَمکُر الله والله خیرُ الما کرین**[4] سے مراد، کفار اور مشرکوں کی سازشیں ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنا یا اسیر بنانا چاہتے تھے ؛اور یمکُرُ اللہ سے مراد،خداوند عالم کی وہ تدبیر ہے جس میں اس نے رسول کو ہجرت کا حکم دیا۔ اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ مکر السیئی صفت کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے[5]

یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس بنا پر بہت سی آیتوں میں جو لفظ مکر خدا کے لئے استعمال ہوا ہے اس سے مراد یہ ہے تمام تدبیروں کا مالک خداوند عالم ہے اور کوئی تدبیر خداوند عالم کی تدبیر کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتی اسی بنا پر خداوند عالم ہر مدبر سے بالا اور برتر ہے۔[6]

سورہ رعد[7] کی آیت صاف صاف اعلان کر رہی ہے کہ تمام مجموعی تدبیروں کا مالک خدا ہے اور خداوند عالم کی تدبیر کے آگے دوسروں کی تدبیریں کسی کام کی نہیں ہیں۔[8]

حواشی:

[1] قرشی، سید علی اکبر، قاموس قرآن، ج6، ص265۔

[2] المنجد، ترجمہ محمد بندر ریگی، ج2، ص1820۔

[3] اعراف، 99، 123، فاطر، 10و43۔ سباء، 33۔ یونس، 21۔ آل عمران، 54۔ النحل، 26، 45۔ النمل، 50و51۔ نوح، 22۔ ابراہیمؑ، 46۔ یوسف، 13۔ غافر، 45۔

[4] انفال، 30۔

[5] فاطر، 43۔

[6] آل عمران، 45۔

[7] رعد، 42۔

[8] علامہ طباطبائی، المیزان، ترجمہ موسوی ہمدانی، 20 جلدی، ناشر انتشارات اسلامی، ج12، ص355۔

جمادات اور نباتات خداوند متعال کی تسبیح کیسے کرتے ہیں؟

مختصر جواب

کائنات کی مخلوقات کے بارے میں انسان کی معلومات انتہائی محدود ہیں۔مخلوقات خداوند متعال کی تسبیح کیسے کرتے ہیں؟ یہ ان مسائل میں سے ہے کہ انسان ابھی تک اس کی کیفیت کو معلوم نہیں کرسکا ہے۔

متعدد آیات و روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ ہستی کے تمام اجزاء، پروردگار کی تسبیح پڑھنے والے ہیں۔ہستی کے اجزاء کی تسبیح کی کیفیت کے بارے میں مفسرین کے درمیان دو نظریے پائے جاتے ہیں:

۱۔مخلوقات کی زبان حال سے تسبیح، کہ اپنے پورے وجود سے کہتی ہیں کہ: اگر مجھ میں کوئی عیب ہے تو وہ میری ذات کا لازمہ ہے اور خداوند متعال اس عیب سے منزہ و پاک ہے۔

۲۔مخلوقات کی زبان قال سے تسبیح، البتہ موجودات کا قیل و قال اور ان کی گفتگو، انسانوں اور حیوانوں کے درمیان رائج صورت میں نہیں ہے بلکہ اس کی اپنی خاص نوعیت ہے کہ ابھی تک انسان کا علم اس کی کیفیت معلوم نہیں کرسکا ہے۔

تفصیلی جوابات

کائنات کی مخلوقات کے بارے میں انسان کی معلومات انتہائی محدود اور اس کی لاعلمی کی نسبت سے ناچیز ہیں۔ ہم چیونٹیوں، کیڑوں اور حشرات کے علاوہ بہت سی دوسری مخلوقات کی باہمی گفتگو کرنے کی کیفیت اور باہمی روابط کے بارے میں آگاہی نہیں رکھتے ہیں، حتی کہ ہم میں ان کی آوازیں سننے کی طاقت بھی نہیں ہے، کیونکہ ہماری سننے کی طاقت صرف ان آوازوں کو سن سکتی ہے، جن کی فری کوینسی (frequency) ایک خاص حد میں ہو اور اس سے زیادہ یا کم والی فری کوینسی کی آوازیں سننے کی طاقت ہم میں نہیں ہے، جبکہ یہ مخلوقات قطعا آپس میں تعلقات رکھتی ہیں۔

مخلوقات خداوند متعال کی تسبیح کیسے کرتی ہیں؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ انسان کو ابھی تک اس کا علم حاصل نہیں ہوسکا ہے، اس بنا پر ہم اس کی کیفیت کا تصور نہیں کر سکتے ہیں۔ متعدد آیات و روایات میں عالم ہستی کی تمام مخلوقات کی تسبیح کی صراحت کی گئی ہے۔[1]

تسبیح یعنی خداوند متعال کو مخلوقات میں پائی جانے والی ہر قسم کی ناتوانیوں اور عیب ونقص سے منزہ اور پاک جاننا۔

امام صادقؑ سے سبحان اللہ کے بارے میں سوال کیا گیا۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا: یعنی بندگی کے لحاظ سے خداوند متعال کے، ہر قسم کی برائی سے پاک ومنزہ ہونے کا اظہار کرنا۔[2]

مخلوقات (جمادات ونباتات) کی تسبیح کی کیفیت کے بارے میں مفسرین نے دو نظریے پیش کئے ہیں:

۱۔ زبان حال سے تسبیح اور ۲۔ زبان قال سے تسبیح

۱۔ زبان حال سے تسبیح:

بعض مفسرین نے مخلوقات کی تسبیح کو زبان حال کی تسبیح سے تعبیر کیا ہے اور اس کی تمام ہستی اور مخلوقات کی ذات باری تعالی اور اس کے صفات کمالیہ کی دلالت سے تفسیر کی ہے، اور مخلوقات درحقیقت اپنے خالق کی زبان حال میں توصیف کرتی ہیں (رنگ رخسار خبری می دہد از سر ضمیر) اور کہتی ہیں: اگر مجھ میں کوئی عیب ہے تو وہ میری ذات کا لازمہ ہے اور خداوند متعال اس عیب سے منزہ و پاک ہے۔

ابو نصر فارابی، طبرسی، فخر رازی اور آلوسی، مخلوقات کی تسبیح کو زبان حال سے جانتے ہیں۔ تفسیر نمونہ میں بھی یہی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ فارابی، مخلوقات کی تسبیح اور نماز کے بارے میں تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''صلّت السماء بدورانها و الأرض برجانها و المطر بهطلانه'' (آسمان اپنی گردش سے بارگاہ الہی میں نماز بجالاتا ہے، زمین ہلنے سے نماز ادا کرتی ہے اور پانی برسنا، بارش کی نماز ہے[3]) اس نظریہ کے مطابق مخلوقات اور کائنات کے ذرات کی تسبیح کا تصور اور اس کی تصدیق کافی حد تک قابل ادراک ہے، کیونکہ کائنات کا ہر ذرہ جو بھی کام انجام دیتا ہے، وہی اس کی تسبیح ہے۔

۲۔ زبان قال سے تسبیح:

اس قسم کی تسبیح اور ستائش سے مراد یہ ہے کہ تمام مخلوقات عاقل ہیں اور صاحب شعور ہیں اور اس کے علاوہ کہ زبان حال سے پروردگار عالم کی تسبیح اور حمد و ثنا بجالاتی ہیں، زبان قال سے بھی خدا کی ستائش میں مشغول ہیں۔ لیکن ہم اجمالی طور پر جانتے ہیں کہ اس قسم کی تسبیح اس پر مبنی ہے کہ تمام حیوانات اور جمادات اپنی شان کے تناسب سے ادراک اور نفوس ناطقہ رکھتے ہیں اور ہر مخلوق اپنے نفس ناطقہ سے اپنے پروردگار کی تسبیح کرتی ہے اور کائنات کے ذرے ذرے میں مخلوقات کی تسبیح کا ایک شور غوغا برپا ہے۔ لیکن اس کو سننا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اور صرف اہل دل اور وہی افراد کائنات میں ہونے والی تسبیح کی

آواز سن سکتے ہیں جنھوں نے مادیات کے پردے چاک کئے ہوں۔

اس سلسلہ میں مولانا رومی نے کیا خوب فرمایا ہے:

گر تورا از غیب چشم باز شد

باتو ذرات جہان ہمراز شد

نطق آب و نطق خاک و نطق گل

ہست محسوس حواس اہل دل

معاصر علماء میں سے جو اس نظریہ کے قائل ہیں، ان میں سے علامہ طبا طبائی اور شہید مرتضی مطہری کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

علامہ طبا طبائیؒ فرماتے ہیں: تمام مخلوقات کی تسبیح حقیقی اور تسبیح زبان قال ہے اور قال کے لئے ضروری نہیں ہے کہ بالکل الفاظ کو سنا جائے اور طے شدہ ہو۔[4]

اس بنا پر نباتات اور جمادات کی تسبیح بھی حقیقی تسبیح اور تسبیح زبان قال ہے اور یہ کہ ہم ملائکہ اور مومنین کی تسبیح کو زبان قال کی تسبیح کہیں اور دوسری مخلوقات کی تسبیح کو زبان حال کی تسبیح کہیں صحیح نہیں ہے۔ انسان کو اہل دل، اہل معنی اور اہل حقیقت بننا چاہیے تا کہ ماورائے طبیعت کو بھی ادراک کر سکے۔ جب ہم یہ ادراک حاصل کریں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تمام مخلوقات کیسے درک کرنے والے، باہوش، عالم اور اپنے پروردگار کی حمد وثنا اور تسبیح کرنے والی ہیں۔

قرآن مجید حضرت داودؑ کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

آپ ان کی باتوں پر صبر کریں اور ہمارے بندے داود کو یاد کریں جو صاحب طاقت بھی تھے اور بیحد رجوع کرنے والے بھی تھے ہم نے ان کے لئے پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا کہ ان کے ساتھ صبح وشام تسبیح پروردگار کریں اور پرندوں کو ان کے گرد جمع کر دیا تھا سب

ان کے فرمانبردار تھے[5]

مذکورہ آیات میں دو نکتے ایسے ہیں جو مخلوقات کی زبان قال میں تسبیح کرنے کی تائید کرتے ہیں: ان میں سے ایک اپنے پروردگار کی تسبیح کرنے میں پہاڑوں اور پرندوں کا حضرت داود کا ساتھ دینا: معہ یسبحن اگر مخلوقات کی تسبیح سے یہاں پر مراد زبان حال سے تسبیح ہوتی تو ان کا داود کا ساتھ دینا بے معنی ہوتا۔ آیات کا سیاق، ایک ہی سیاق ہے۔ اس بنا پر اس کے معنی نہیں ہیں کہ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کو ہم زبان حال کی تسبیح سے نسبت دے دیں، اور حضرت داود کی تسبیح کو زبان قال کی، تسبیح سے نسبت دیں، کیونکہ زبان حال کی تسبیح ہمیشہ اور داود کے بغیر بھی موجود ہے۔ دوسرا نکتہ یہ کہ آیہ شریفہ میں فرمایا گیا ہے کہ: صبح و شام کے وقت پہاڑ اور پرندے تسبیح پروردگار کرنے میں حضرت داود کا ساتھ دیتے تھے۔ ممکن ہے ہم یہ کہیں کہ صبح و شام، شب و روز کی طرف کنایہ ہے اور درنتیجہ تسبیح دائمی ہے۔ لیکن پہلے والے نکتہ [داود کا ساتھ دینے) کے پیش نظر قابل بیان ہے کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داود کے ساتھ ہمزمان اور ہم صدا تسبیح میں شرکت کرتے تھے۔ یعنی جب داودؑ تسبیح شروع کرتے تھے تو، پرندے اور پہاڑ بھی اس کے ہم نوا ہوتے تھے۔ پس عشی اور ابکار سے مراد طلوع وغروب کے حقیقی معنی ہیں، اور اس صورت میں تسبیح کے معنی پہاڑوں اور پرندوں کا وجود خدا کے وجود کی دلیل اور زبان حال کی تسبیح کی تفسیر نہیں ہوسکتی ہے اور جس طرح ہم نے بیان کیا، اس قسم کی تسبیح ہمیشہ اور ہر زمانہ میں موجود ہے اور اس کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی ہے کہ صبح و شام اور حضرت داودؑ کے وجود سے مخصوص ہو۔ حضرت داودؑ سن رہے تھے کہ پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے ہیں، ایک اور کان تھا جس سے وہ اشیاء کے باطن اور ملکوت تک پہنچ چکے تھے اور ان کی ملکوتی آواز سنتے تھے۔ اگر ہمارے باطنی کان کھل جائیں تو ہم بھی سنیں گے۔[6]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتھیلی پر کنکریوں کی گفتگو کی داستان [7] کے بارے میں شہید مطہری (رح) فرماتے ہیں: یہاں پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ یہ نہیں تھا کہ کنکریوں کو تسبیح پڑھائی، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ یہ تھا کہ لوگوں کے کانوں کو کھول دیا اور انہوں نے کنکریوں کی آواز سنی۔ وہ کنکریاں تو ہمیشہ تسبیح پڑھتی تھیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ اس آواز کو ان کانوں کو سنانا تھا نہ کہ کنکریوں کو بات کرانا۔[8]

اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ مخلوقات کی قولی و کلامی تسبیح کو ممکن ہے کہ پاک دل اور خود ساختہ انسان ادراک کرسکیں۔

حواشی

[1] اسراء،44: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اس کی تسبیح کررہے ہیں اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اس کی تسبیح نہیں کرتی ہو، یہ اور بات ہے کہ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو۔

[2] الکافی ج 1 ص، 118 حدیث 10:... هِشَامِ بْنِ الْحَكَمِ قَالَ سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ عليه السلام عَنْ سُبْحَانَ اللَّهِ فَقَالَ أَنَفَةٌ لِلَّهِ

[3] تسبیح موجودات

[4] ترجمہ المیزان، ج13،ص:152

[5] ص،19-17: وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿17﴾ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ﴿18﴾ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿19﴾

[6] ملاحظہ ہو. المیزان فی تفسیر القرآن، ج13،ص:121-120

[7] بحار الانوار ج 57 ص 169

[8] مطہری، مرتضی؛ آشنایی با قرآن، ج4،ص174.

''انا سنلقی علیك قولاً ثقیلا'' میں قول ثقیل سے کیا مراد ہے؟

مختصر جواب

آیت اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡكَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ۝ میں قول ثقیل سے مراد خود قرآن مجید ہے ؛ اگرچہ مفسرین نے قول ثقیل سے الگ الگ وضاحتیں فرمائی ہیں جن میں سے ہر الگ الگ پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ اس قول کے سنگین ہونے سے مراد جو بلا شبہ قرآن کریم ہے اس کے مختلف پہلو ہیں یعنی قرآن سنگین ہے آیات کے معنی ومفہوم کے لحاظ سے دلوں پر ان مطالب کی

سنگینی کے لحاظ سے۔ تبلیغ اور دعوت کی مشکلات کے لحاظ سے۔ منصوبہ بندیوں اور ان پر عمل کے لحاظ سے

تفصیلی جوابات

ثقلی (سنگینی) جسم کے لئے ایک خاص کیفیت ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا تحمل کرنا اور ادھر سے ادھر منتقل کرنا دشوار ہوتا ہے ؛ اور کبھی یہی لفظ جسم سے الگ معنوی امور میں استعمارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ آج کا سبق سخت اور سنگین تھا یعنی شاگردوں کے لئے اس کا سمجھنا دشوار تھا۔ یا کہتے ہیں کہ آج کی تقریر جو دقیق عملی

نظریات سے بھری تھی عوام کے لئے سنگین تھی۔ اس طرح کی تعبیروں میں سنگین کا لفظ جو غیر مادی اعتبار سے استعمال ہوا ہے یا معنوی امور سے متعلق ہے جن کا ادراک کرنا دشوار ہے یا ان حقائق کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے جن تک پہنچنا سخت ہے یا ایسا فرمان یا حکم ہوتا ہے جس کا بجالانا یا اس کی پابندی کرنا سخت اور دشوار ہے

قرآن کریم جو کلام الٰہی ہے دونوں اعتبار سے (یعنی معنی سمجھنے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے اعتبار سے) ثقیل ہے یعنی سمجھنے کے اعتبار سے اس لئے ثقیل ہے کہ وہ کلام الٰہی ہے اور پیغمبر اسلام نے اسے خدا سے حاصل کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے کلام کو ہر طرح کی برائی و پلیدی سے پاک افراد ہی سمجھ سکتے ہیں ایسے افراد جنہوں نے ہر سبب سے رابطہ توڑ کر صرف سبب الاسباب خدا سے دل لگا رکھا ہے یہ کلام الٰہی ہے اور ایسی عزیز کتاب ہے جس کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی تنزیل بھی ہے اور تاویل بھی۔ ہر چیز کا بیان ہے اس کی سنگینی حضرت رسول خداؐ کی حالت سے ظاہر ہے سب دیکھتے تھے کہ وحی نازل ہوتے وقت پیغمبر اکرمؐ کی کیا حالت ہوتی تھی اور پھر قرآن کے ان تعارف وتعلیمات کو عملی جامعہ پہنانا یعنی توحید واعتقادی واخلاقی تعلیمات کو عملی شکل میں ڈھالنا بھی اس قدر سنگین ہے کہ اس سنگینی کو قرآن کریم یوں فرماتا ہے لو انزلنا ہاذا القران علی جبل لرآیتہً خاشعاً متصد عاً خشیتہ اللہ۔۔[1] کہ پہاڑ بھی برداشت اور تحمل نہیں رکھتا کہ قرآن اس پر نازل ہو سکے اور اگر پہاڑ پر نازل ہو جاتا تو پہاڑ خوف خدا سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

قرآن نہ صرف ان دو اعتبارات سے سنگین ہے بلکہ اسے کاج کے اندر رائج کرنے لوگوں کو اس کی طرف دعوت دینے کے اعتبار سے کہ وہ اس پر عمل کریں نیز تمام ادیان پر اس دین کی برتری کے اعتبار سے بھی سنگین ہے اس کے گواہ وہ مصائب وآلام ہیں جو تبلیغ دین اور خدا کی راہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اٹھانا پڑے اور وہ اذیتیں اور تکلیفیں ہیں جو خدا کے لئے

آپ نے برداشت کی ہیں کہ قرآن کریم نے ان اذیتوں اور مضحکوں کا کچھ ذکر کیا ہے جو آنحضرت نے مشرکین اور کفار و منافقین سے دیکھے ہیں لہٰذا وہ فرماتا ہے اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا۝۵ سے مراد یہی قرآن کریم ہے

اس بناء پر اگرچہ مفسروں نے قول ثقیل کی الگ الگ وضاحت کی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے لیکن نظر آتا ہے کہ اس قول ثقیل سے مراد جو بلا شبہ قرآن کریم ہے خود اس کے مختلف پہلو ہیں قرآنی آیات معنی و مفہوم کے اعتبار سے دلوں پر اس کی سنگینی کے اعتبار سے اس کی تبلیغ اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات

کے اعتبار سے اور اسے سماج میں رائج کرنے کے اعتبار سے۔۔۔ بھی سنگین ہے۔[2]

حواشی

[1] سورہ حشر۔۲۱

[2] ر۔ک۔: طباطبائی؛ سید محمد حسین؛ المیز ان؛ ترجمہ؛ موسوی ہمدانی؛ سید محمد باقر ج ۲۰ ص ۹۷۔ دفتر انتشارات اسلامی؛ قم؛ چاپ پنجم ۱۳۷۴ ش مکارم شیرازی؛ ناصر؛ تفسیر نمونہ ج ۲۵ ص ۱۶۹ ۱۷۰؛ دارالکتب الاسلامیہ تہران ۱۳۷۴ ش

قرآن کریم میں "فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ" کیوں آیا ہے جب کہ بشارت کے مثبت معنی ہوتے ہیں؟

مختصر جواب

قرآن اور لغت میں لفظ (بشارت) اچھی اور بری دونوں خبر کے لئے آتا ہے، لیکن قرائن کی روشنی میں ان دونوں معنی میں سے ایک مشخص ہوتا ہے۔ قرآن کریم استعمال شدہ لفظ بشارت میں اندوہ ناک خبر ایک طرح کا استعار ہو تحکم ہے یعنی عذاب کے علاوہ کوئی اور چیز ان کے لئے نہیں ہے کیونکہ موعظہ و پند و نصیحت کفار و بت پرستی کے دلوں پر کوئی اثر نہیں کرتی لہٰذا خداوند عالم نے پیغمبرؐ سے فرمایا کہ انہیں دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے۔

تفصیلی جوابات

قرآن اور لغت میں لفظ (بشارت) اچھی اور بری دونوں خبروں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔[1] لیکن قرائن کے مطابق ان دونوں میں سے ایک خبر مشخص ہوتی ہے۔

لفظ ''بشارت'' قرآن میں نہیں آیا ہے لیکن اس کے مشتقات ذکر ہوئے ہیں جیسے ''بشریٰ'': ''وَمَا جَعَلَهُ اللهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ ''[2] خداوند عالم نے اسے (فرشتوں کی نصرت کو) تمہارے لئے بشارت اور خوش خبری قرار دیا ہے۔ لفظ ''بشریٰ'' اس آیت اور اس جیسی آیات میں خوش خبری کے معنی میں آیا ہے۔ لیکن لفظ ''بشر'' قرآن کریم میں ۔۔۔ اچھی

اور بری دونوں خبروں کے معنی میں آیا ہے مثلا:(وَبَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ)[3] جولوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اچھے اعمال کئے ہیں انہیں جنت کے ان باغوں کی بشارت دے دیجئے۔۔۔۔ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔لفظ ''بشّر'' اس آیت میں خوش خبری کے معنی میں آیا ہے۔

''بَشِّرِ الۡمُنٰفِقِیۡنَ بِاَنَّ لَهُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۙ﴿۱۳۸﴾''[4] منافقون کو بشارت دے دیجئے کہ دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔ اور''فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۴﴾''[5] ان آیات میں لفظ''بشّر '' بری اور اندوہ ناک خبر کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو ایک طرح کا استعارہ اور تحکم ہے، یعنی عذاب کے علاوہ ان کے لئے کوئی اور چیز نہیں ہے۔[6] کیونکہ کفار اور بت پرستوں کے دل پر کسی موعظہ اور نصیحت کا اثر نہیں ہوتا لہٰذا خداوندعالم نے پیغمبرؐ سے فرمایا کہ انہیں دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے اور یہ ایک طرح کالعن اور سرزنش ہے۔[7]

حواشی

[1]۔قریشی، سید علی اکبر، قاموس قرآن ج۱،ص ۱۹۴، دار الکتب ال إسلامیۃ، تہران، چاپ ششم، ۱۳۷۱ ش؛ طریحی، فخر الدین، مجمع البحرین، تحقیق: حسینی، سید احمد، ج ۳،ص ۲۲۱، کتابفروشی مرتضوی، تہران، چاپ سوم، ۱۳۷۵ش۔

[2]۔آل عمران، ۱۲۶۔ [3]۔بقرہ، ۲۵۔

[4]۔نساء، ۱۳۸۔ [5]۔انشقاق، ۲۴۔

[6]۔قاموس قرآن، ج۱،ص ۱۹۴؛ مجمع البحرین، ج ۳،ص ۲۲۱۔

[7]۔حسینی ہمدانی، سید محمد حسین، انوار درخشان، تحقیق: بہبودی، محمد باقر، ج ۱۸،ص ۶۲ و ۶۳، کتابفروشی لطفی، تہران، چاپ اول، ۱۴۰۴ق؛ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ۲۶،ص ۳۱۹، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، چاپ اول، ۱۳۷۴ش۔

اسلامی روایات کے مطابق روح کی ماہیت کیا ہے اور قرآن مجید میں اس سلسلہ میں کیوں وضاحت نہیں کی گئی ہے؟

قرآن مجید میں ایک آیہ شریفہ ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ: اور پیغمبر؛ یہ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دیجیئے کہ یہ میرے پروردگار کا ایک امر ہے اور تمھیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔ (اسراء۔۸۵)۔ مہربانی کر کے فرمایئے، کہ، اولاً: پیغمبر (ص) روح کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات کیوں پیش کرنا نہیں چاہتے تھے؟ ثانیاً: احادیث کے مطابق، روح کیا ہے؟ کیا یہ دیکھنے کے قابل ہوگی؟

مختصر جواب

مختلف علوم میں لفظ روح کے معنی مختلف ہیں اور اس لفظ کے ہر علم میں اپنے خاص معنی ہیں اور قرآن مجید کی اصطلاح میں بھی اس کے خاص معنی ہیں اور اس لفظ کو مختلف تعبیرات میں استعمال کیا گیا ہے۔

اس آیہ شریفہ میں روح کے معنی میں سے کس معنی کی ماہیت مدنظر ہے، اس کے بارے میں چند احتمالات پیش کیے گئے ہیں، **من جملہ**: روح حیوانی، روح انسانی (نفس

ناطقہ)، روح القدس یا جبرئیل اور روح، ملائکہ سے برتر مخلوق کے معنی میں۔لیکن جو کچھ مسلم ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد علم طب میں بیان کی جانے والی روح حیوانی نہیں ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اس روح کی پہچان علوم کی دسترس سے دور نہیں ہے۔ اسی طرح اس روح سے جبرئیل بھی مراد نہیں لئے جاسکتے ہیں، کیونکہ بعض آیات میں اس روح یعنی جبرئیل کو ملائکہ کے ساتھ اور ان سے ایک متمایز امر کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے اور بعض روایتیں بھی اس مطلب کی صراحت کے ساتھ دلالت پیش کرتی ہیں۔

اس آیہ شریفہ کے مطابق، روح کی ماہیت کے بارے میں صرف اسی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ روح ایک مجرد حقیقت ہے اور امر الٰہی کی ایک قسم ہے اور جو امر خداوند متعال سے منسوب ہو، وہ زمان و مکان اور دوسری مادی خصوصیات سے بالاتر ہوتا ہے۔

اس قسم کے الٰہی امر کی کیفیت اور مراتب کا ادراک کرنا، علوم کشفی کے اسرار میں شمار ہوتا ہے اور یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ خود پیغمبر (ص) بھی ان امور سے بہرہ مند نہیں تھے، لیکن چونکہ لوگوں کی اکثریت میں اس قسم کا ادراک نہیں پایا جا سکتا ہے، اس لئے اس سلسلہ میں کچھ بیان کرنا عقل کے لئے حیرت ناک تھا، لہٰذا، بظاہر قرآن مجید میں روح کی پہچان کے سلسلہ میں زیادہ وضاحت پیش نہیں کی گئی ہے۔

مذکورہ بیان سے ظاہر ہے کہ، چونکہ روح، زمان و مکان اور دوسری تمام مادی خصوصیات سے بالاتر ایک حقیقت ہے، اس لئے حس کے ذریعہ قابل ادراک اور ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے قابل نہیں ہے، لیکن روح کے بعض اثرات اور تمثیلیں لطیف مادہ کے قالب میں آشکار ہوسکتی ہیں، من جملہ مثالی بدن میں، جو عالم برزخ میں روح کا قالب ہے۔

یہ قابل ذکر ہے کہ بعض علوم کی اصطلاح میں اور اسی طرح بعض روایتوں کی تعبیرات کے مطابق بظاہر اسی مثالی بدن کو روح کہا گیا ہے، کیونکہ یہ بدن، روح کے مادی

جسم سے جدا ہونے کے بعد، اس کا حامل ہوتا ہے اور روحانی اثرات کو زیادہ تر آشکار کر سکتا ہے۔ یہ مثالی بدن، اپنے عالم میں دیکھنے اور کشف کرنے کے قابل ہوتا ہے، لیکن اس کا اس روح کی حقیقت سے موازنہ نہیں کرنا چاہئے جو خداوندمتعال سے منسوب ہے اور امر الٰہی کی ایک قسم ہے، کیونکہ عالم ہستی میں اس روح کا مقام امور سے بالاتر ہوتا ہے اور یہ اسرار الٰہی میں شمار ہوتا ہے۔

تفصیلی جوابات

مقدمہ:

ادیان، حکمت، فلسفہ اور عرفان میں ایک اہم اور بنیادی بحث، انسانی اور عالمی جہت سے روح کی پہچان ہے۔ روح کی ماہیت کے بارے میں اسلامی متکلمین اور فلاسفہ نے مختلف اقوال بیان کیے ہیں اور آیات و روایات میں بھی اس سلسلہ میں اجمالی طور پر کچھ مطالب بیان کیے گئے ہیں، لیکن قرآن مجید کے معنی میں (جس میں زیادہ تر ملائکہ سے بالاتر حقیقت کی طرف اشارہ ہے) کلی طور پر روح کی حقیقت ظاہری علوم اور دانشوروں کے افکار کی پہنچ سے بالاتر ہے اور اس کے لئے کشفی معرفت کی ضرورت ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے کہ معرفت نفس ہی معرفت رب ہے اور وہی روح کی حقیقت کی شناخت ہے[1]۔

۲۔ روح سے کیا مراد ہے؟

قابل ذکر ہے کہ مختلف علوم میں لفظ روح سے مراد مختلف ہے اور یہ لفظ ہر علم میں، خواہ قدیم علوم میں، خواہ جدید علوم میں، خاص اصطلاحی معنی رکھتا ہے اور قرآن مجید کی اصطلاح میں بھی اس کے خاص معنی ہیں کہ مختلف تعبیرات کے ضمن میں اس کا استفادہ کیا گیا ہے من جملہ لفظ الروح[2] مطلق طور پر روحی[3] روح منہ[4]، روح الامین[5]، روح القدس[6] وغیرہ۔

۳۔سورہ اسراء کی آیت نمبر ۸۵ میں روح:

قرآن مجید کی آیات میں سے ایک آیت، جس میں روح کی ماہیت کے بارے میں اجمالی اشارہ کیا گیا ہے، وہ سورہ اسراء کی آیت نمبر ۸۵ ہے کہ ارشاد ہوتا ہے: سأ لونک عن الروح قل الروح من امر ربي و ما اوتيتم من العلم الا قليلاً پیغمبر؛ یہ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دیجئیے کہ یہ میرے پروردگار کا ایک امر ہے اور تمہیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

اس آیہ شریفہ میں روح سے مراد کون سی روح ہے، اس سلسلہ میں پہلے چند احتمالات پیش کیے جاتے ہیں،من جملہ: روح حیوانی، روح انسانی (نفس ناطقہ)، روح القدس یا جبرئیل اور روح، ملائکہ سے برتر مخلوق کے معنی میں۔لیکن جو کچھ مسلم ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد علم طب میں بیان کی جانے والی روح حیوانی نہیں ہوسکتی ہے۔کیونکہ اس روح کی پہچان علوم کی دست رس سے دور نہیں ہے۔

اسی طرح اس روح سے مراد جبرئیل بھی نہیں ہیں، کیونکہ مذکورہ آیت کے علاوہ قرآن مجید کی دوسری متعدد آیات میں لفظ روح کو دہرایا گیا ہے اور اس قرینہ کے پیش نظر کہ اس لفظ کو ملائکہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے (الملائكة و الروح) اس لئے مسلم طور پر یہ ملائکہ کے علاوہ ہے اور بعض روایتوں کی صراحت کے مطابق اس تمایز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ علامہ طباطبائی، وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ والی آیت میں روح کی کیفیت کے بارے میں کہتے ہیں: روح بظاہر جبرئیل اور غیر جبرئیل کے علاوہ ایک بہت ہی وسیع تر مخلوق ہے۔

یہاں پر ہم بعض ان روایتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو روح کے، ملائکہ اور جبرئیل کے علاوہ ہونے کی دلیل پیش کرتی ہیں:

۱۔ اتی رجل امیر المومنین علیہ السلام یسأله عن الروح الیس هو جبرئیل

فقال له امیر المومنینؑ: جبرئیل من الملائکه و الروح غیر جبرئیل[7]؛

ایک شخص نے حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا: کیا روح وہی جبرئیل ہیں؟ حضرتؑ نے جواب میں فرمایا: جبرئیل مالئکہ میں سے ہیں اور روح جبرئیل کے علاوہ ہے۔

۲۔ عَنْ أَبِي بَصِيرٍ قَالَ سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِؑ عَنْ قَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي قَالَ خَلْقٌ أَعْظَمُ مِنْ جَبْرَئِيلَ وَ مِيكَائِيلَ كَانَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ص وَ هُوَ مَعَ الْأَئِمَّةِ وَ هُوَ مِنَ الْمَلَكُوتِ؛[8]۔

ابی بصیر نے امام صادقؑ سے خداوندمتعال کے اس قول: یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی کے بارے میں سوال کیا۔ حضرتؑ نے جواب میں فرمایا: یہ جبرئیل اور میکائیل سے عظیم تر ایک مخلوق ہے، جو رسول خدا (ص) کے ہمراہ تھی اور ائمہ اطہارؑ کے ساتھ ہے اور عالم ملکوت میں سے ہے۔

اس کے باوجود ہم بعض آیات میں دیکھتے ہیں کہ جبرئیل کو روح الامین کے طور پر متعارف کیا گیا ہے، لیکن ان دو مطالب کی وجہ جمع، علامہ طباطبائی کے اشارہ کے مطابق، قرآن مجید کے اشاروں سے قابل استنباط ہے اور وہ یہ کہ جبرئیل اور ملائکہ روح کو اپنے تنزل و ترقی کے سلسلہ میں حمل و نقل کرنے والے ہیں اور اس کا ساتھ دیتے ہیں اور اسی لحاظ سے روح ایک صورت میں ملائکہ اور جبرئیل کی لازم و ملزوم ہے اور ایک صورت میں ان سے الگ ہے[9]۔

۴۔ قرآن مجید اور سورہ اسراء کی آیت ۸۵ میں روح کی ماہیت:

روح کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں، خداوندمتعال نے مذکورہ آیہ شریفہ

میں اجمالی طور پر بیان فرمایا ہے: قل الروح من امر ربی۔ کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کا ایک امر ہے۔ امر الٰہی کی ماہیت ہمارے لئے ظاہر ہونے کے لئے بعض آیات کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے، من جملہ آیہ شریفہ: انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون[10] اس کا امر صرف یہ ہے کہ کسی شئے کے بارے میں یہ کہنے کا ارادہ کر لے کہ ہو جا اور وہ شئے ہو جاتی ہے۔

علامہ طباطبائی نے تفسیر المیز ان میں اس آیہ شریفہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ روح امر الٰہی کی ایک قسم ہے اور ذات الٰہی کے فصل کے بارے میں مخصوص ہے، اسی لحاظ سے روح بھی امر الٰہی کی ایک قسم ہے اس لئے اس کا زمان و مکان اور کسی دوسری مادی چیز سے موازنہ نہیں کیا جاتا ہے[11]۔

اس روح کی قرآن مجید میں مختلف تعبیروں سے توصیف کی گئی ہے، اول یہ کہ اسے الگ اور مطلق طور پر ذکر کیا گیا ہے، جیسے مذکورہ آیت میں، اس کے علاوہ کبھی ملائکہ کے ہمراہ ذکر کیا گیا ہے اور کبھی وہ حقیقت ہے جو عام انسانوں میں پھونکی جاتی ہے اور کبھی وہ حقیقت ہے جو مومنین کی ہمراہی اور ان کی تائید کرتی ہے اور کبھی ایک ایسی حقیقت ہے جس کے ساتھ انبیاء کا رابطہ ہے۔

۵۔ روح کی ماہیت کے بارے میں کیوں زیادہ وضاحت نہیں کی گئی ہے؟

روح کی ماہیت کے بارے میں صرف اسی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ روح ایک مجرد حقیقت ہے اور امر الٰہی کی ایک قسم ہے اور جو امر خداوند متعال سے منسوب ہو، وہ زمان و مکان اور دوسری مادی خصوصیات سے بالاتر ہوتا ہے۔ لیکن اس امر الٰہی کی کیفیت اور مراتب کو سمجھنے کے لئے شہودی علم کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ علم اسرار مکاشفہ شمار ہوتا ہے اور چونکہ اکثر لوگ اس قسم کے ادراک سے عاری ہوتے ہیں، لہٰذا اس سلسلہ میں بات کرنا عقل کے

لئے قابل حیرت و تعجب ہوتا ہے اور شائد ضلالت کا سبب بھی ہو۔ اس بنا پر قرآن مجید میں روح کی پہچان کے بارے میں زیادہ تفصیلات بیان نہیں ہوئی ہیں۔

اس لحاظ سے یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ خود پیغمبر (ص) بھی اس علم سے بہرہ مند نہیں تھے، اسی طرح روح کی ماہیت کو پہچاننا کشف و یقین کی منزل میں ہے اور یہ عارفوں کا مقام ہوتا ہے اور جو لوگ اس علم سے محروم ہیں ان کے لئے اس کا بیان کرنا عملی طور پر کوئی فائدہ نہیں دیتا ہے [12]۔

لیکن جملہ: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴿۸۵﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ اس مسئلہ سے علماء نے بظاہر استفادہ کیا ہے وہ مشتے از خروارے ہے اور روح کی حقیقت ایک بالاتر امر ہے اور اسے حاصل کرنا کشفی علوم کے علاوہ ممکن نہیں ہے۔

۶۔ مذکورہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ، چونکہ روح، زمان و مکان اور دوسری مادی خصوصیات سے بالاتر ایک حقیقت ہے، اس لئے حس کے ذریعہ قابل ادراک ہے اور بظاہر دیکھنے کے قابل نہیں ہے، اگرچہ معصومینؑ کے لئے روح کی حقیقت کے سلسلہ میں مکاشفہ اور شہود قلبی ممکن ہے اور شاید عرفا بھی اجمالی طور پر اس شہود سے مستفید ہوں اور روح کے مجرد ہونے سے اس کی کوئی منافات نہیں ہے، اس طرح روح کے بعض اثرات اور تمثیلیں (نہ کہ ذاتی طور پر خود روح) لطیف جسم کے قالب میں آشکار ہوسکتی ہیں اور مثالی صورت میں، من جملہ عالم برزخ کے مثالی بدن میں قابل مکاشفہ ہیں، جو دنیوی جسم کے مشابہ ہوتا ہے لیکن لطافت و نورانیت کے لحاظ سے مثالی جسم دنیوی جسم سے بالاتر ہوتا ہے۔

قابل ذکر بات ہے کہ بعض علوم کی اصطلاحات میں اور بعض روایتوں کی تعبیرات میں اسی مثالی جسم کو روح کہا گیا ہے، کیونکہ یہ جسم روح کو مادی جسم سے جدا ہونے کے بعد اٹھانے والا ہوتا ہے اور کافی حد تک روح کے اثرات کو آشکار کرسکتا ہے۔ یہ مثالی جسم، مجرد

محض نہیں ہوتا ہے اس لئے مثالی حالت میں قابل دید و مکاشفہ ہے۔ دوسری جانب، اس کا روح کی حقیقت، جو خدا سے منسوب ہے اور امر الٰہی کی ایک قسم ہے، سے موازنہ نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ عالم ہستی میں روح کا مقام ان امور سے بالاتر ہے اور اسرار الٰہی میں شمار ہوتا ہے۔

حواشی

[1] احمد بن محمد حسین اردکانی، مرآت الاکوان (تحریر شرح ہدایہ ملاصدرا)، ص37، ناشر، میراث مکتوب.

[2] الاسراء، 85؛ غافر، 15.

[3] الحج، 29؛ صاد، 72.

[4] المجادلہ، 22؛ النساء، 171.

[5] الشعراء، 193.

[6] بقرہ، 87 و 253؛ مائدہ، 110؛ نحل 102.

[7] کلینی، کافی، ج 1، ص 274، دارالکتب الاسلامیۃ، تہران، 1365 ھ ش.

[8] کافی، ج1، ص273.

[9] طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ج 13، ص 171 - 172، جامعہ مدرسین، قم، 1374.

[10] یس، 82.

[11] المیزان، ج 1، ص 528 - 529.

[12] مرآت الاکوان (تحریر شرح ہدایہ ملاصدرا)، ص36.

بداء لوح محفوظ، کتاب مبین، لوح محو و اثبات کا مفہوم اور معنی کیا ہیں؟

مختصر جواب

لغت میں لفظ بداء کے معنی پنہاں ہونے کے بعد ظاہر ہونا ہیں اور قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے: وَبَدَا لَهُمْ لهٰذَا مِّنَ اللهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ۝٤٧۔ بعض علماء کی اصطلاح میں تکوین میں بداء، تشریع میں نسخ کے مانند ہے اور نئی رائے کے معنی میں ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ خداوند متعال کی طرف سے بداء اور نسخ ممکن نہیں ہے، کیونکہ ان کا لازمہ خدا کے علم کا پہلے جہل ہونا ہے اور خداوند متعال جہل سے منزہ و پاک ہے۔ چنانچہ حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: ان الله لم یبد له من جهل، خداوند متعال کے لئے جہل کے سبب کوئی بداء نہیں ہے۔ اور جو چیز خداوند متعال کے بارے میں قابل تصور ہے، وہ ظاہری بداء و نسخ ہے، یعنی لوگوں کے لئے کسی ایسے امر کو ظاہر کرنا جو ان کے لئے ماضی میں پوشیدہ و پنہاں تھا اور اس کو خداوند متعال ازل سے جانتا تھا اور جس صورت میں ظاہر ہوا ہے اسی صورت میں آغاز سے ہی مقدر کیا تھا، لیکن اس کی تکلیف کے مطابق کسی مصلحت کے تحت ایک خاص مدت تک کے لئے لوگوں سے اسے پنہاں رکھا تھا اور اسے وقت آنے پر ظاہر کیا ہے اور یہ معنی معقول اور قابل قبول ہیں۔ تغییر و تقدیر یعنی بداء کے بارے

میں واضح ترین آیت یہ ہے: لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ﴿٣٨﴾ يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ﴿٣٩﴾ ہر مدت اور معیاد کے لئے ایک کتاب (اور قانون) مقرر ہے۔ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے، اسے مٹا دیتا ہے یا برقرار رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔

کیونکہ خداوند متعال کا علم، بقول امام صادق علیہ السلام، دو قسم کا ہے: پہلا، علم مکنون ومخزون ہے جسے وہ خود جانتا ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے کہ خود بداء (سرچشمہ) اسی علم سے ہے، دوسرا وہ علم ہے جسے خداوند متعال نے فرشتوں اور انبیاء علیہم السلام کو سکھایا ہے اور ہم بھی اس علم سے آگاہ ہیں۔ اس بنا پر جس علم سے بداء ظہور پاتا ہے، وہ لوح محفوظ ہے اور جو علم بداء سے متعلق ہے وہ لوح محو و اثبات ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ لوح محفوظ اور لوح محو و اثبات (مٹا دینے یا برقرار رکھنے کی لوح) سے مقصود و مراد کیا ہے۔

لوح محفوظ و لوح محو و اثبات:

لوح محفوظ (اصل کتاب) سے مراد و مقصود وہی خداوند متعال کا ازلی علم ہے، جس میں مقدمات ثابت اور ناقابل تغیر ہوتے ہیں۔ بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق لوح محفوظ اور کتاب مبین ایک ہی چیز ہے، کیونکہ کتاب مبین وہی علم پروردگار کا مقام ہے، اور آیہ شریفہ میں ارشاد ہوتا ہے: زمین و آسمان میں ذرہ برابر کوئی چیز تیرے پروردگار سے مخفی نہیں ہے اور چھوٹی بڑی چیزوں میں سے کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کتاب مبین میں درج نہیں ہے۔ اور لوح محو و اثبات سے مراد، صفحہ ہستی، کائنات اور فطرت ہے جس میں ہر ایک چیز کی تقدیر درج ہے،، لیکن ان مقدرات میں سے کوئی ثابت و پائدار نہیں ہے، بلکہ ان سب میں مصلحت اور ضرورت کا پہلو ہوتا ہے۔

نتیجہ کے طور پر لوح محو و اثبات میں مصلحتوں اور ضرورتوں کے مطابق تغیّر و تبدّل کا سلسلہ جاری ہے اور بداء بھی اسی سے متعلق ہے۔ اس کے برعکس لوح محفوظ (خداوند متعال کا

ازلی علم)، جس کو کتاب مبین اور ام الکتاب (اصل کتاب) بھی کہا جاتا ہے، ناقابل تغیّر اور مستقل ہے۔

تفصیلی جوابات

بداء کے لغوی اور اصطلاحی معنی:

بداء کی اصل بدوّ ہے اور اس کے معنی شدید طور پر ظاہر ہونا ہے[1]، اور اصطلاح میں کہا گیا ہے کہ: نسخ کے مانند بداء کے بھی دو معنی ہیں:

۱۔ خداوند متعال کے لئے نئی رائے کا ظاہر ہونا، جس کے بارے میں اس سے پہلے وہ آگاہی نہیں رکھتا تھا، اور بعد میں اس سے آگاہ ہوا ہو، یہ معنی باطل ہیں اور اس کا خداوند متعال کی طرف منسوب کرنا ناممکن اور ممتنع ہے۔

۲۔ لوگوں کے لئے ایک ایسا امر ظاہر کرنا جو ماضی میں ان کے لئے پوشیدہ تھا، یعنی اس امر کو خداوند متعال ازل سے جانتا تھا اور اسی ظاہر کی ہوئی نئی صورت میں پہلے سے مقدر کر چکا تھا، لیکن کسی مصلحت اور ضرورت کی بنا پر ایک مدت کے لئے اسے لوگوں سے مخفی رکھا تھا اور اس کے بعد اپنے وقت پر اسے ظاہر و آشکار کیا ہے، یہ معنی معقول اور قابل قبول ہیں [2]۔ علمائے شیعہ، اہل بیت اطہار علیہم السلام کی روایتوں سے استناد کر کے بداء کے معنی کے بارے میں اعتقاد رکھتے ہیں کہ بداء کو صرف اس صورت میں خدا سے نسبت دی جا سکتی ہے جب ایک ایسی چیز کو ظاہر کرنا ہو جو پہلے ظاہر نہ تھی اور غیر متوقع بھی ہو[3]۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ: خداوند متعال نے تمام (انبیاء علیہم السلام) سے توحید کے ساتھ بداء پر ایمان کا بھی عہد و پیمان لیا ہے[4]۔ یا ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں: جو شخص یہ خیال کرے کہ خداوند متعال کے لئے کوئی ایسا نیا مسئلہ واضح ہوا ہے، جسے وہ پہلے نہیں جانتا تھا، اس سے بریّت اختیار کرنا چاہئے[5]۔

جو آیات اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں، ان میں یہ آیت بھی ہے:۔۔۔لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ۝٣٨ يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ۝٣٩ [6] یعنی: ہر مدت اور معیاد کے لئے ایک کتاب (اور قانون) مقرر ہے۔ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے، اسے مٹا دیتا ہے یا برقرار رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔

اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ خداوند متعال جس علم کے ذریعہ اپنی مخلوقات کے حالات کی تدبیر کرتا ہے، وہ دو قسم کا ہے: ان میں سے ایک علم مخزون ہے، کہ جس کے بارے میں خداوند متعال کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں ہے، اسے لوح محفوظ کہا جاتا ہے۔ اور دوسرا وہ علم ہے جسے خداوند متعال نے اپنے فرشتوں، انبیاء علیہم السلام اور اولیائے الٰہی کو سکھایا ہے، اس علم کو لوح محو و اثبات کہا جاتا ہے۔ اور علم کا یہی وہ حصہ ہے جس میں بداء کی گنجائش ہے [7]۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: خداوند متعال کا علم دو حصوں پر مشتمل ہے: پہلا علم مکنون و مخزون ہے جس کے بارے میں خداوند متعال کے بغیر کسی کو آگاہی حاصل نہیں ہے۔ دوسرا وہ علم ہے جسے اس نے اپنے فرشتوں اور انبیاء علیہم السلام کو سکھایا ہے اور ہم بھی اس سے آگاہ ہیں [8]۔ اس بنا پر ہمارے پاس دو قسم کے علم ہیں: ایک وہ علم، جو بداء کا سرچشمہ ہے اور وہ لوح محفوظ ہے اور دوسرا وہ علم ہے، جس سے متعلق بداء ہے اور وہ لوح محو و اثبات ہے۔ پس، بداء یعنی، پہلے مٹنا اور پھر برقرار رہنا اور خداوند متعال دونوں کے بارے میں عالم ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس سے کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا ہے، کیونکہ امور و حوادث کے محقق ہونے اور وجود میں آنے کے لئے دو قسم کی دور اندیشیاں قابل تصور ہیں: ایک قابل تغیر تحقق، جو ناقص اسباب کے مطابق ہوتا ہے، جیسے شرط یا علت یا عدم مانع۔ دوسرا، نا قابل تغیر تحقق اور وجود، جو حوادث کے اسباب و علل تامہ کے مطابق ہوتا ہے، اور ایک مستقل، غیر مشروط اور نا قابل تغیر وجود ہے۔ آیہ شریفہ میں ذکر کی گئی دو کتابیں، یعنی کتاب محو و اثبات اور

ام الکتاب، حقیقت میں اس وجود کے دو مرحلے یا ان کا سرچشمہ ہیں [9]۔

لوح محفوظ، کتاب مبین اور لوح محو و اثبات:

۔۔۔۔وعندنا کتاب حفیظ[10]۔ اور ہمارے پاس ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہر چیز محفوظ ہے۔ یا آیہ شریفہ فی لوح محفوظ[11]، یہ آیات اس بات کی دلیل پیش کرتی ہیں کہ ایک ایسی کتاب ہے، جو تمام انسانوں وغیرہ کے اعمال کی حفاظت کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کتاب تمام حوادث کے حالات، افراد کے کوائف اور ان میں پیدا ہونے والے تغیرات پر مشتمل ہے، لیکن خود اس کتاب میں کسی قسم کی تبدیلی اور دگرگونی پیدا نہیں ہوتی ہے۔ بہت سے مفسرین کے کہنے کے مطابق، لوح محفوظ اور کتاب مبین ایک ہی چیز ہے۔ کتاب مبین سے مراد خداوند متعال کا وہی مقام علم ہے، یعنی تمام مخلوقات، پروردگار عالم کے لامتناہی علم میں درج اور اس کے گواہ ہیں، اور یہ وہ آیتیں ہیں، جن میں بیان ہوا ہے:۔۔۔۔تمہارے پروردگار سے زمین و آسمان کا کوئی ذرہ دور نہیں ہے اور کوئی شے ذرہ سے بڑی یا چھوٹی ایسی نہیں ہے جسے ہم نے اپنی کھلی کتاب میں جمع نہ کر دیا ہو[12]۔ اور زمین پر چلنے والی کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جس کا رزق خدا کے ذمہ نہ ہو۔ وہ ہر ایک کے سونپے جانے کی جگہ اور اس کے اقرار کی منزل کو جانتا ہے اور سب کچھ کتاب مبین (لوح محفوظ یعنی خدا کے علم کی کتاب) میں محفوظ ہے[13]۔ اور یہ آیات اس بات کی دلیل پیش کرتی ہیں کہ یہ وسیع عالم ہستی بھی اسی لوح محفوظ کی عکاسی کرتا ہے۔ پس، **لوح محفوظ** (ام الکتاب) اور **کتاب مبین** (کھلی کتاب) سے مراد وہی خداوند متعال کا ازلی علم ہے، جس میں مقدرات محکم، مستقل، ثابت اور نا قابل تغیر ہیں۔ اس کے برعکس لوح محو و اثبات ہے جس میں ہر چیز کی تقدیر اور قسمت درج ہے، لیکن ان تقدیرات میں سے کوئی بھی مستقل اور پائدار نہیں ہے، بلکہ ان سب کا ادعائی پہلو ہوتا ہے۔ لوح محو و اثبات سے مراد کائنات، عالم

ہستی اور جہان فطرت ہے، کہ ہر ایک چیز کی تقدیر اپنی فطرت میں، تقاضے اور ضرورت کے مطابق ہے کہ عدم مانع اور علت تامہ کی صورت میں ہر چیز پیدا ہوگی اور ہم رکاوٹ کے بارے میں علم نہیں رکھتے ہیں۔ جبکہ خداوند متعال اس کے بارے میں علم رکھتا ہے۔ اس لئے علی بن الحسین علیہ السلام فرماتے ہیں: اگر قرآن مجید میں کوئی آیت نہ ہوتی تو میں قیامت تک کہتا کہ کیا حوادث رونما ہوتے ہیں ؛۔ زرارہ کہتے ہیں کہ: میں نے پوچھا کون سی آیت؟ امام ؑ نے جواب میں فرمایا: یمحو اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب[14] پس لوح محو و اثبات زمانہ و مدت میں محدود ہونے والے تمام حوادث پر مشتمل ایک عام حکم ہے۔ بہ الفاظ دیگر، آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان موجود تمام مخلوقات اس کے زمرہ میں آتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: ہم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی تمام مخلوقات کو حق کے ساتھ اور ایک مقررہ مدت کے ساتھ پیدا کیا ہے[15]۔

مذکورہ پوری بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مصلحتوں اور زمان و مکان کی ضرورتوں کے مطابق لوح محو و اثبات میں تغیّر و تبدّل جاری ہے۔ اس کے برعکس لوح محفوظ (خداوند متعال کا ازلی علم) نا قابل تغیّر ہے۔ پس تمام مخلوقات کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو اس کے تغیر وتبدل کا ہے، کہ اس کے مطابق تمام مخلوقات موت و حیات، زوال و بقا اور مختلف قسم کی تبدیلیوں سے دو چار ہوتی ہیں۔ اور دوسرا پہلو ثبات کا ہے، جس کے مطابق مخلوقات کسی صورت میں بھی قابل تغیر نہیں ہوتی ہیں اور اپنی پہلی قسم میں باقی رہتی ہیں۔

حواشی

[1] قرشی، سید علی اکبر، قاموس قرآن، ج 1، ص 172.

[2] معرفت، ہادی، تفسیر و مفسران، مؤسسہ فرہنگی التمہید، طبع اول اردیبہشت 1379 ش، ج 1، ص 522.

[3] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج 10، ص 249.

[4] کافی، دارالکتاب ال اسلامی، تہران، 1365 ھ، ص 148، حدیث 15.

[5] سفینۃ البحار، ج 1، ص 51، وقریب بہ مضمون حدیث، کافی، ایضاً، ص 148، حدیث 9.

[6] رعد، 38 و 39.

[7] معرفت، ہادی، تفسیر ومفسران، ایضاً، ص 523.

[8] مجلسی، بحار الانوار، ج 4، ص 109 ۔ 110، شمارہ 27، ومضمون بہ ہمین حدیث در کافی، انتشارات اسوہ، 1372، ج 1، ص 423، حدیث 8.

[9] علامہ طباطبائی، تفسیر المیزان، ترجمہ فارسی موسوی ہمدانی، 20 جلدی، بنیاد علمی وفکری علامہ، تاریخ 1363 ھ، ج 11، ص 584.

[10] سورہ ق، 4.

[11] سورہ بروج، 22.

[12] سورہ یونس، 61.

[13] سورہ ہود، 6.

[14] عروسی حویزی، تفسیر نور الثقلین، مؤسسہ اسماعیلیان، تاریخ 1373 ہش، ج 2، ص 512.

[15] سورہ احقاف، 3.

قرآن مجید میں بیان ہوئے سات آسمانوں کے کیا معنی ہیں؟

مختصر جواب

آسمانوں اور کہکشانوں کے بارے میں سائنسی لحاظ سے پائے جانے والے ابہامات کے پیش نظر، قرآن مجید میں بیان کئے گئے سات آسمانوں کے بارے میں قطعی طور پر کوئی نظریہ پیش نہیں کیا جاسکتا ہے، بلکہ اس سلسلہ میں احتمال وگمان کی صورت میں چند نظریہ پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن اس نکتہ سے غافل نہیں رہنا چاہئے کہ قرآن مجید کا مقصد انسان کی معنوی تربیت و ہدایت ہے اور قرآن مجید کا سات آسمانوں و زمین، سورج اور زمین کی حرکت وغیرہ کے بارے میں اشارہ ان کی حقیقت کے علاوہ خداوند متعال کی لافانی قدرت کی نشاندہی اور خدا کو پہچاننے کی راہ کو ہموار کرنا اور خلقت کے بارے میں تفکر و تدبر کرنے کے لئے زمینہ آمادہ کرنا ہے اس کے علاوہ قرآن مجید کے بعض علمی مطالب کے لئے زمانہ اور تجربی علم میں ثابت ہونے کی ضرورت ہے اور اگر سائنس نے قرآن مجید کے علمی مسائل میں کوئی نظریہ پیش نہ کیا تو وہ قرآن مجید کے نظریہ کے باطل ہونے کی دلیل نہیں ہے

تفصیلی جوابات

سات آسمانوں کے مقصود کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ذیل میں چند

نکات بیان کریں:

پہلا نکتہ: قرآن مجید میں، سات جگہوں پر واضح[1] طور پر دو جگہوں پر کنایہ [2] کی صورت میں سات آسمانوں کی بات کی گئی ہے اور ایک جگہ پر بظاہر سات زمینوں کا ذکر کیا گیا ہے [3]

دوسرا نکتہ: لغت میں سماء (آسمان) کا مقصد:

لغت میں سماء، سمو کے مادہ سے بلندی کے معنی میں ہے،[4] حتیٰ بعض اہل لغت نے دعویٰ کیا ہے کہ ہر بلندی نچلے حصہ کی بہ نسبت آسمان ہے اور ہر نچلا حصہ اس کی بلندی کی بہ نسبت زمین ہے [5]

تیسرا نکتہ: قرآن مجید میں آسمان:

قرآن مجید میں لفظ سماء (آسمان) اور اس کے مشتقات تین سو دس بار آئے ہیں اور دو معنی میں استعمال ہوئے ہیں:

الف مادی آسمان:

قرآن مجید نے بہت سی جگہوں پر لفظ سماء (آسمان) اس کے مادی معنی میں استعمال کیا ہے کہ ان کے متعدد مصداق و معانی ارادہ ہوتے ہیں، من جملہ:

1 آسمان اوپر کی جہت کے معنی میں ،اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾[6] کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کس طرح کلمہ طیبہ کی مثال شجرہ طیبہ سے بیان کی ہے جس کی اصل ثابت اور اس کی شاخ آسمان تک پہنچی ہوئی ہے

2 آسمان، زمین کے اطراف کی فضا کے معنی میں: وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا[7] اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا ہے

3 آسمان، سیاروں اور ستاروں کی جگہ کے معنی ہیں: بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں چراغ اور چمکتا ہوا چاند قرار دیا ہے [8]

ب معنوی معنی میں آسمان:

قرآن مجید میں بہت جگہوں پر لفظ سماء (آسمان) کو اس کے معنوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے، ان سے بھی متعدد مصداق اور معانی ارادہ ہوتے ہیں من جملہ:

1 آسمان، مقام قرب اور مقام حضور کے معنی میں کہ جو عالم کے امور کی تدبیر کی جگہ ہے: وہ خدا آسمان سے زمین تک کے امور کی تدبیر کرتا ہے [9]

2 آسمان ایک عالی اور حقیقی [10] موجود کے معنی میں: اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور جن باتوں کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے [11]

چوتھا نکتہ: سبع (سات) کا مراد کیا ہے؟

لفظ سبع (سات) عربی میں دو صورتوں میں استعمال ہوا ہے:

الف سات، ایک مشخص و معین عدد کے معنی ہیں جو ریاضیات میں استعمال ہوتا ہے

ب کثرت کی علامت کے معنی میں، کیونکہ بعض اوقات عربی میں سات کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس کے کنایہ کے معنی (زیادہ تعداد اور کثرت) مراد ہوتے ہیں

پانچواں نکتہ: سات آسمان کے لفظ سے قرآن مجید کا مقصد

مفسرین نے لفظ سات آسمان کے بارے میں کئی احتمال بیان کئے ہیں:

الف اگر سات، حقیقی عدد کے معنی میں ہو تو اس صورت میں مندرجہ ذیل احتمالات قابل تصور ہیں:

1 ستاروں اور سیاروں سے بھرے سات آسمان جن میں سے ہر ایک کرہ زمین کے آسمان کے مانند ہے [12] سات مشابہ دنیا کے وجود کا احتمال ہے جو ابھی کشف نہیں

ہوئے ہیں

2 فطرت کے سات پست مراتب وجودی کے مقابل میں قرب وحضور کے سات عالی ومعنوی مقام (سات آسمان[13])

ب اگرسات، کثرت کے معنی میں ہوتو اس صورت میں مندرجہ ذیل احتمالات قابل تصور ہیں:

1 بہت سے آسمان (کثرت و سیارات وغیرہ کا مجموعہ) پیدا کئے ہیں اور بہت سی زمینیں (زمین کے مانند خاکی کرات) پیدا کئے ہیں کہ یہ سب فضا میں تیرتے اور معلق ہیں

2 آسمان کے بہت سے فضاؤں کو پیدا کیا ہے اور زمین کے اندر بہت سے طبقات یا زمین کے ٹکڑوں اور ممالک کو پیدا کیا ہے

3 بہت سے عالی مخلوقات معنوی مراتب و مقامات قرب وحضور پیدا کئے ہیں نتیجہ یہ کہ، ہماری عدم معرفت اور کافی اطلاعات نہ رکھنے کے پیش نظر اور آسمانوں اور کہکشانوں کے بارے میں سائنسی نظریات کے مطابق پائے جانے والے شبہات کے پیش نظر ہم قرآن مجید میں بیان کئے گئے سات آسمانوں کے معنی کے بارے میں کوئی قطعی نظریہ پیش نہیں کرسکتے ہیں اوراس سلسلہ میں تمام نظریات احتمال اور گمان کی صورت میں پیش کئے جاتے ہیں [14] لیکن اس نکتہ کونہیں بھولنا چاہئے کہ قرآن مجید کا مقصد انسان کی معنوی تربیت اور ہدایت کرنا ہے اورقرآن مجید کا سات آسمانوں اور زمین، سورج اور زمین کی حرکت وغیرہ کے بارے میں اشارہ ان کی حقیقت کے علاوہ خداوند متعال کی لافانی قدرت کی نشاندہی اور خدا کو پہچاننے کی راہ کو ہموار کرنا اور خلقت کے بارے میں تفکر وتدبر کرنے کے لئے زمینہ آمادہ کرنا ہے اس کے علاوہ قرآن مجید کے بعض علمی مطالب کے لئے زمانہ اور تجربی علوم میں ثابت ہونے کی ضرورت ہے اور اگر سائنس نے قرآن مجید کے علمی مسائل میں کوئی نظریہ پیش نہ کیا تو وہ

قرآن مجید کے نظریہ کے باطل ہونے کی دلیل نہیں ہے مزید مطالعہ کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے:

1 پژوہش دراعجاز علمی قرآن، تالیف: محمد علی رضائی اصفہانی ج، 1 ص 134

2 معارف قرآن تالیف محمد تقی مصباح یزدی، ص 234

3 تفسیر نمونہ، ناصر مکارم شیرازی ج 1، ص 165 [15]

حواشی

[1] بقرہ، 29: اسراء: مومنون، 86: فصلت، 12

[2] ملک، 3: نوح، 15

[3] طلاق، 12 اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الۡاَمۡرُ بَیۡنَهُنَّ

(3) اللہ وہی ہے جس نے ساتوں آسمان کو پیدا کیا ہے اور زمینوں میں بھی ویسی ہی زمینیں بنائی ہیں

[4] التحقیق می کلمات القران الکریم، حسن مصطفوی، (انتشارات وزارت فرھنگ و ارشاد اسلامی، ج 1، تھران، 1371 ش) ج 5، ص 254

[5] مفردات، راغب اصفہانی، المکتبہ الرضویہ، تھران، 1332 ش، مادہ سماء

[6] ابراہیمؑ، 24

[7] ق، 9

[8] تَبٰرَکَ الَّذِیۡ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّجَعَلَ فِیۡهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیۡرًا ﴿۶۱﴾ (سورہ فرقان، 61)

[9] یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ (سورہ سجدہ، 5)

[10] ملاحظہ ہو: معارف قرآن، استاد مصباح یزدی، (انتشارات در راہ حق، قن، 1367 ش)، ص 234: و ملاحظہ ہو پژوہش دراعجاز علمی قرآن دکتر محمد علی رضائی اصفہانی، انتشارات مبین، رشت، ج 1، 1380، ج 1، ص 134

[11] وفی السماء رزقکم و ما توعدون (ذاریات، 22)

[12] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم ایضاً، ج 1،ص 165،مفردات راغب، مادہ ارض

[13] ملاحظہ ہو: المیز ان، علامہ طباطبایی ،نشر اسراء قم، ج 16،ص 247 و ج 19،ص 327

[14] ملاحظہ ہو: تفسیر الجوہر، طنطاوی جوہری، دار الفکر، بی تا، ج 1،ص 46: ملاحظہ ہو: بزوہش در اعجاز قرآن، دکتر محمد علی رضائی اصفاھانی، ہمان، ج 1،ص 126 132

[15] ملاحظہ ہو: سایٹ پایگاہ مرکز فرھنگ و معارف قرآن

شراب طہور کیا ہے؟

مختصر جواب

شراب پینے والی چیز کے معنی میں ہے اور طہور پاک اور پاک کرنے والی چیز کے معنی میں ہے۔ مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت میں مختلف قسم کی پاک اور خوشگوار پینے والی چیزیں ہوں گی۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں شراباً طہوراً کی تعبیر بیان ہوئی ہے: اور انہیں ان کا پروردگار پاکیزہ شراب سے سیراب کرے گا۔ شراب طہور کیا ہے؟ اس سلسلہ میں تین قول پائے جاتے ہیں:

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پینے والی چیز ہے جو بہشتی غذاؤں کے بعد پی لی جاتی ہے اور یہ تمام اندرونی فضلات کو پاک کرتی ہے، اور صرف خوشبودار پسینہ کی صورت میں ایک چیز انسان کے جلد سے خارج ہوتی ہے۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ: اس سے مراد معنوی اور روحانی سیر و سلوک کے لئے روحانی اور معنوی فائدے ہیں، چنانچہ امام صادق علیہ السلام سے روایت نقل کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: جب مومن شراب طہور پئے گا تو وہ خدا کے علاوہ تمام چیزوں سے اجتناب کر کے اپنے مولا (خدا) کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ امام باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ: مومنین جب اس شراب (طہور) کی کچھ مقدار پئیں گے تو خداوند متعال اس کی وجہ سے ان کے دلوں کو حسد و کینہ سے پاک کر دے گا۔

۳۔ کچھ لوگوں نے مذکورہ دو نظریوں کو جمع کر کے ایک درمیانی نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے: چونکہ انسان تاریک، مکدر، سیاہ گوں مٹی اور روح خدا کی ایک خوبصورت آمیزش ہے، اور چونکہ خداوند متعال نے اس کے لئے مادی رزق کے علاوہ روحانی اور معنوی فائدے بھی عطا کئے ہیں اور چونکہ انسان اپنے سیر وسلوک میں مختلف ہیں، لہٰذا ان کے بہشتی مراتب بھی گونا گوں ہیں۔ قرآن مجید کی آیات میں بہشتی شراب کو بہترین اور خوبصورت ترین تعبیر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس شراب کو پلانے والے خوبصورت ترین ساقی ہوں گے جو قد و قامت کے لحاظ سے زیبا اور خوشنما آنکھوں والے صفوں میں جام لئے ہوئے کھڑے ہوں گے اور بہشتیوں کو پلانے کے لئے گردش میں ہوں گے، یہ ایسی شراب ہو گی جس سے بہشتیوں کو خاص لذّت محسوس ہو گی وہ شراب نہ اُن کی عقل میں خلل ڈالے گی، نہ انہیں بدمست کرے گی اور نہ ان کے بدن کو کوئی ضرر پہنچائے گی۔ کئی دوسری آیات میں آیا ہے کہ بعض بہشتی جیسے ابرار (نیکوکار بندے) رحیق مختوم نامی شراب سے سیراب ہوں گے جس سے ان پر باطل سے تحفظ کی مہر لگے گی اور آلودگی سے محفوظ ہوں گے مقربین درگاہ الٰہی کا اجر چشمہ تسنیم کی شراب ہو گی جس کا ساقی خود ذات اقدس الٰہی اور اس کا ساغر اس کی معرفت و محبت کی حقیقت ہو گی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا: تسنیم، بہشت کی بہترین شراب ہے، جسے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ (ص) کے اہل بیت علیہم السلام نوش فرماتے ہیں، اصحاب یمین اور باقی بہشتی اس کے مخلوط محلول کو پیتے ہیں۔

نتیجہ کے طور پر، جس طرح دنیا میں انسانوں کے مختلف درجے اور مراتب ہیں، اسی طرح بہشت میں بھی گونا گوں مراتب ہیں اور بہشتی اپنی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق ان مراتب سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس لئے قرآن مجید میں ان کے بارے میں مختلف تعبیریں استعمال کی گئی ہیں۔ بعض کو اصحاب یمین بعض کو ابرار اور بعض کو مقربین درگاہ الٰہی کہا جاتا

ہے۔ اوران کے مقامات کے اعتبار سے انہیں فائدہ بھی ملتا ہے۔

تفصیلی جوابات

شراب پینے کی[1] چیز کے معنی میں ہے اور قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے ارشاد الٰہی ہے: اور طرح طرح کے میوے اور شراب ان کے اختیار میں ہوں گے[2]۔ اور وہ وہی خدا ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے جس کا ایک حصہ پینے والا ہے[3]۔ اور طہور ایک ایسی چیز کے معنی میں ہے جو خود بھی پاک ہے[4] اور پاک کرنے والی بھی ہے[5]: اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی برسایا ہے[6]۔

شراب طہور:

مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت میں مختلف قسم کے مزیدار، پاک[7] اور گوناگوں کیفیتوں کے مشروب موجود ہیں۔ نہروں میں بہنے والی رقیق چیزیں، ذات اور جوہر کے لحاظ سے بھی اور کیفیت اور مزے کے لحاظ سے بھی دنیوی رقیق چیزوں سے مختلف ہیں، کیونکہ دنیوی نہروں میں پانی کے علاوہ کوئی چیز نہیں بہتی ہے، اور یہ پانی ایک مدت کے بعد بدبو دینے لگتا ہے، لیکن بہشت کی نہروں میں بہنے والی سیّال و رقیق چیزیں ان دو لحاظ سے خاص امتیاز کی حامل ہیں، جن کے بارے میں قرآن مجید کی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں، بہشت کی چار نہروں میں بہنے والی چار رقیق چیزوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے[8]۔ پیاس بجھانے کے لئے پانی کی نہر، تغزیہ کے لئے دودھ کی نہر، لذت اور قوت بخشنے کے لئے شہد کی نہر اور نشاط اور شادمانی حاصل کرنے کے لئے شراب کی نہر۔ یہ پینے والی چیزیں اس طرح خلق کی گئی ہیں کہ ایک زمانہ گزر جانے کے بعد بھی ہرگز ہرگز ان میں عفونت اور تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہیں[9]۔ دوسری آیات میں رحیق مختوم یا تسنیم[10] یا کافور کی آمیزش والی شراب[11] یا زنجبیل[12] کی شراب کا نام لیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت

میں شَرَابًا طَهُورًا اور وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ [13] کی تعبیر بیان کی گئی ہے۔ یعنی: ان کا پروردگار ان (بہشتیوں) کو شراب طہور پلاتا ہے، جس کا ساقی خود خداوند متعال ہے۔

مفسرین کے اقوال:

بہشتیوں سے مخصوص حیات بخش شراب کے بارے میں مفسرین کے نظریات کو تین حصوں میں پیش کیا جا سکتا ہے:

ا۔ یہ کہ شراب طہور سے مراد وہ شراب ہے جسے بہشتی کھانا کھانے کے بعد پیتے ہیں اور یہ شراب ان کے تمام اندرونی فضلات کو پاک کرتی ہے اور ان کے بدن کی جلد سے صرف ایک خوشبودار اور معطر پسینہ خارج ہوتا ہے [14]۔ یہ تصور بہشت کی نعمتوں اور غذاؤں کے بارے میں ان کی بہتر اور لزیز تر کیفیت اور خصوصیت کے ساتھ ایک مادی تصور ہے۔ چنانچہ روایات [15] اور قرآن مجید کی آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ اس شراب کو پلانے والے خوبصورت ترین ساقی ہوں گے جو قدوقامت کے لحاظ سے زیبا اور خوشنما آنکھوں والے صفوں میں جام لئے ہوئے کھڑے ہوں گے اور بہشتیوں کو یہ شراب پلانے کے لئے گردش میں ہوں گے، یہ ایسی شراب ہوگی جس سے بہشتیوں کو خاص لذّت محسوس ہوگی، وہ شراب نہ عقل کو مختل کرے گی نہ انہیں بدمست کرے گی اور نہ ان کے بدن کو کوئی ضرر پہنچائے گی [16]۔

۲۔ اس سے مراد ہے، معنوی سیر و سلوک کے لئے روحانی فوائد، تفسیر المیز ان میں اس شراب کی معنوی پاکیزگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ شراب خداوند متعال سے غفلت اور اس کی طرف توجہ کرنے میں پردوں کی رکاوٹ کو ہٹاتی ہے [17]۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جب مومن شراب طہور پئے گا، تو وہ خدا

کے سوا تمام چیزوں سے اجتناب کر کے اپنے مولا (خدا) کی طرف متوجہ ہوگا[18]۔ تفسیر الطیب البیان میں آیا ہے کہ شراب طہور ابرار اور نیکوکاروں کے دلوں کو بُرے صفات، فاسد خیالات، وہم و غم اور گندگیوں سے پاک کرتا ہے[19]۔ امام باقر علیہ السلام سے ایک روایت میں نقل کیا گیا ہے کہ: جب مومنین اس شراب سے کچھ مقدار پی لیتے ہیں، تو خداوند متعال اس کے توسط سے ان کے دلوں کو حسد و کینہ سے پاک کرتا ہے[20]۔ بعض بزرگوں کا فرمانا ہے کہ: چونکہ توحید میں محو ہو جانا اور غیر خدا سے قطع تعلق کرنا مکمل طہارت میں مضمر ہے، اس لئے جو بھی چیز اس سے ہم آہنگ نہ ہو وہ ملکہ طہارت سے مفقود ہے، اگر ایسی شراب اس قسم کے ساقی کے ہاتھوں پی لی جائے، تو وہ انسان کو غیر خدا کی تمام چیزوں سے پاک کر دے گی۔ (چنانچہ) یہ مضمون اہل بیت علیہم السلام کی وسیع تعلیمات پر مبنی ہے[21]۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت نقل کی گئی ہے کہ آپؑ فرماتے ہیں: یہ شراب ان (بہشتیوں) کے جسم و جان کو خدائے لاشریک کے علاوہ تمام چیزوں سے پاک و پاکیزہ کر ڈالے گی، کیونکہ صرف خداوند متعال کی پاک ذات اور اس کی یاد اور اس کا نام ہی انسان کو ناپاکیوں اور آلودگیوں سے پاک کر سکتا ہے[22]۔

۳۔ بعض مفسرین نے مذکورہ دو نظریات کو جمع کر کے ایک درمیانی نظریہ پیش کرتے ہوئے فرمایا ہے[23]: چونکہ انسان تاریک، مکدر، سیاہ گوں مٹی اور روح خدا کا ایک خوبصورت آمیزہ ہے، اور خداوند متعال نے اس کے لئے مادی رزق کے علاوہ روحانی اور معنوی فائدے بھی عطا کئے ہیں اور چونکہ انسان اپنے سیر و سلوک میں متفاوت ہیں، اس لئے ان کے بہشتی مراتب بھی گوناگوں ہیں۔ بعض (بہشتی) مانند ابرار رحیق مختوم نامی مزیدار شراب سے سیراب ہوتے ہیں اور اس سے انہیں باطل سے تحفظ کی ضمانت ملتی ہے اور وہ ہر قسم کی آلودگی سے منزّہ و پاک ہیں اور مقربین الٰہی کے لئے چشمہ تسنیم کی شراب ہے۔ رسول

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تسنیم بہشت کی بہترین شراب ہے جس سے محمد و آل محمد علیہم السلام استفادہ کرتے ہیں اور اصحاب یمین اور باقی اہل بہشت اس شراب کے ساتھ مخلوط کی گئی شراب پیتے ہیں [24]۔ اس کا ساقی خود ذات اقدس الٰہی ہے: وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿٢١﴾ [25] اور اس بہترین حقیقت و معرفت کا ساغر خود وہی (اللہ) ہے: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿١٣﴾ ۔۔۔۔۔ یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿٢٥﴾ ۔۔۔۔[26] مذکورہ بیانات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح انسان اس دنیا میں کمال کے مختلف درجوں اور مراتب پر فائز ہیں، بہشت میں بھی ان کے مختلف مراتب ہیں اور وہ اپنی ظرفیت اور معنوی صلاحیت کے مطابق بہشت سے استفادہ کرتے ہیں۔ اور اس لئے قرآن مجید میں ان کے بارے میں مختلف تعبیریں استعمال کی گئی ہیں۔ بعض کو اصحاب یمین، بعض کو ابرار اور بعض کو بارگاہ الٰہی کے مقربین کا نام دیا گیا ہے۔ جو اپنے اپنے مقامات کی بہ نسبت بہشت کی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ جو بات مسلم اور حقیقت ہے، وہ یہ ہے کہ بہشتی سرشار اور حیات و سرور بخش لذتوں سے استفادہ کرتے ہیں، لیکن ویسے نہیں جیسے دنیا میں تصور کرتے تھے۔

حواشی

[1] قرشی، سید علی اکبر، قاموس قرآن، ج 4، ص 12.

[2] ص، 51.

[3] نحل، 10.

[4] قاموس قرآن، ہمان، ج 4، ص 242.

[5] فخر رازی، تفسیر الکبیر، ج 30، ص 254.

[6] فرقان، 48.

[7] بظاہر بہشتی شرابوں کی پاکیزگی اس طرح نہیں ہے کہ دنیا میں تصور کیا جاتا ہے، کیونکہ بہشت میں نجاست

کا ہونا ممکن ہی نہیں ہے اور جو کچھ وہاں پر ہے وہ صرف رشد وکمال ہے۔

[8] محمد، 15.

[9] مکارم شیرازی، ناصر، پیام قرآن، تفسیر موضوعی، معاد در قرآن، ج 6، ص 244.

[10] مطففین، 27 و 28.

[11] دہر، 5 و 6.

[12] دہر، 17 و 18.

[13] دہر، 21.

[14] فخر رازی، تفسیر الکبیر، ج 30، ص 254؛ مجمع البیان، ج 10، ص 623.

[15] نور الثقلین، ج 5، ص 32 و 33، کی حدیث 30 کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے جو عبداللہ بن سنان نے حضرت امام صادق ؑ سے نقل کی ہے.

[16] صافات، 45 و 47؛ زخرف، 7.

[17] طباطبائی محمد حسین، تفسیر المیز ان، ترجمہ، موسوی ہمدانی، بنیاد علمی فکری علامہ طباطبایی، 1363، ج 20، ص 361.

[18] منہج الصادقین، ج 10، ص 110؛ مجمع البیان، ج 10، ص 623.

[19] طیب سید عبدالحسین، تفسیر اطیب البیان در تفسیر قرآن، ج 13، ص 327.

[20] تفسیر صافی از کافی، نقل از تفسیر احسن الحدیث، سید علی اکبر قرشی، ج 11، ص 27.

[21] جوادی آملی، تفسیر موضوعی قرآن در قرآن، ج 5، ص 298 و 302.

[22] طبرسی، تفسیر مجمع البیان، ج 10، ص 623.

[23] جوادی آملی، تفسیر تسنیم، اسراء، چاپ اول 1378 ہش، ج 1، ص 27.

[24] بحارالانوار، ج 44، ص 3؛ علم الیقین، ج 2، ص 1253، نقل از تفسیر تسنیم.

[25] انسان، 21.

[26] مطففین، 27 و 28.

آیہ شریفہ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ کیسے رشوت کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے؟

مختصر جواب

یہ آیہ شریفہ ان آیات میں سے ہے جومندرجہ ذیل بیان کے پیش نظر رشوت کے حرام ہونے کی دلالت کرتی ہیں:

ا۔لغوی اعتبار سے سحت کے معنی نابود ہونے، تباہ ہونے اور ختم ہونے کے ہیں۔ اور حرام مختلف لحاظ سے، جیسے عذاب اور تباہی کو اپنے ساتھ لانے، برکت نہ ہونے، مروت اور غیرت کے فقدان وغیرہ کے اعتبار سے سحت جانا جاتا ہے اوراحادیث کے مطابق رشوت بھی سحت کے ایک مصادیق میں سے ہے، پس سحت کے معنی، مال کو حلال طریقوں سے حاصل نہ کرنے کے ہیں۔

۲۔ اس آیہ شریفہ کی تفسیر میں ائمہ اطہار علیہ السلام سے منقول احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے سحت کے مختلف مصادیق میں اہم مصداق رشوت ہے۔ امام صادق علیہ السلام سے سحت کے بارے میں پوچھا گیا۔تو انہوں نے جواب میں فرمایا: سحت حکم)فیصلہ،قضاوت(کرنے میں رشوت لینے کو کہتے ہیں۔

۳۔ مندرجہ بالا موارد کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مفسروں اور فقہاء نے رشوت کے

حرام ہونے میں اس آیہ سے استناد کیا ہے۔

تفصیلی جوابات

اسلامی فقہ میں، رشوت کے حرام ہونے کو اجمالی طور پر قبول کیا گیا ہے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ [1] قرآن مجید کی مختلف آیات میں سے ایک ایسی آیہ شریفہ ہے جس سے رشوت کے حرام ہونے کے سلسلہ میں پر مفسرین اور فقہاء نے استناد کیا ہے۔ یہ جھوٹ کے سننے والے اور حرام کے کھانے والے ہیں۔

یہ آیہ شریفہ یہودی علماء کی توصیف میں نازل ہوئی ہے جن کی ایک خصوصیت رشوت خوری تھی، سحت سے مراد رشوت ہے۔ یہودی علماء لوگوں سے رشوت لے کر خدا کے حکم کو بدل دیتے تھے[2]

سُحت کا لفظ (سین پر ضمہ کے ساتھ) سحت (سین پر فتحہ) سے لیا گیا ہے جو ختم ہونے، تباہ ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے[3] اور حرام، عذاب اور نابودی کو اپنے ساتھ لانے اور برکت نہ رکھنے اور مروت اور غیرت کو سلب کرنے کے لحاظ سے سحت جانا جاتا [4] ہے۔ پس سحت کے معنی یوں ہیں کہ ہر وہ چیز جس کا کمانا حلال نہیں ہے[5] یعنی وہ حرام ہے۔

اس آیہ شریفہ کے ذیل میں ائمہ اطہارؑ سے منقول روایات میں سحت کے مختلف معانی کو مدنظر رکھا گیا ہے[6] کہ جس کا اہم مصداق رشوت ہے۔

حضرت امام صادق (ع) سے سحت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب میں فرمایا: سحت حکم صادر کرنے میں رشوت لینے کے معنی میں ہے[7] ایک اور حدیث میں حکم صادر کرنے میں رشوت لینا، خداوند متعال کے انکار کرنے کے برابر ہے۔[8]

کیونکہ حکم صادر کرنے میں رشوت لینے میں بہت سے مفاسد موجود ہیں اور جو بھی

رشوت حق کو ضائع کرنے اور باطل کو حق جاننے کے لئے لی جائے وہ مفاسد، جیسے جھوٹ بولنا، جھوٹی گواہی دینا، اور مستحقوں سے مال لے کر اسے غیر مستحق کو دینا، جھوٹی گواہی کو سننا اور بے غیرتی وغیرہ کو مشتمل ہے اور چونکہ یہ مفاسد اور برے کام رشوت میں موجود ہیں اس لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار (ع) نے رشوت کو سحت کا سب سے اہم مصداق قرار دیا ہے۔[9]

یہ واضح ہے کہ مذکورہ آیہ شریفہ **سحت** کی حرمت اور اس کے ذریعے کاروبار کرنے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے[10] اس کے علاوہ رشوت کا حرام ہونا جو **سحت** کے اہم مصادیق میں سے ہے اس آیہ شریفہ کی رو سے ہے۔

مفسروں نے اس آیہ کی تفسیر میں **سحت** کے معنی رشوت لئے ہیں نمونہ کے طور پر علامہ طباطبائی نے اس آیہ شریفہ کے ذیل میں **سحت** کے معنی پر بحث کی ہے اور لکھا ہے **اکالون للسحت** یعنی دین کو تباہ کرنے والی چیزوں کو کھاتے ہیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو گوشت **سحت** اور حرام سے بن جائے وہ جہنم کی ہے اور رشوت کا نام بھی **سحت** رکھا گیا ہے پس جو بھی مال حرام طریقے سے حاصل ہو جائے، وہ **سحت** ہے اور آیہ کا سیاق یہ سمجھاتا ہے کہ **سحت** وہی رشوت ہے۔[11]

جس اہم نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اگر رشوت دینے والا ایک باطل مقصد رکھتا ہے تو اس نے حرام کام کیا اور اگر ایک حق کو زندہ کرنے کے لئے رشوت دیتا ہے اور وہ حق صرف رشوت دینے کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے تو اس نے حرام کام انجام نہیں دیا ہے۔ لیکن رشوت لینے والے نے حرام کام انجام دیا ہے چاہے وہ حق پر حکم کرے یا باطل پر رشوت دینے والے کے حق میں حکم دے یا اس کے خلاف۔[12]

حواشی

[1] مائدہ، 42.

[2] طباطبایی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج 5، ص 341، دفتر انتشارات اسلامی، قم، طبع پنجم، 1417ھ.

[3] قرشی، سید علی اکبر، قاموس قرآن، ج 3، ص 237، دار الکتب ال اسلامیۃ، تہران، طبع ششم، 1371ش؛ مہیار، رضا، فرہنگ ابجدی فارسی ـ عربی، ص 72، بی جا و بی تا؛ جزری، ابن اثیر، مبارک بن محمد، النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر، ج 2، ص 345، مؤسسہ مطبوعاتی اسماعیلیان، قم، طبع اول، بی تا.

[4] طریحی، فخر الدین، مجمع البحرین، ج 2، ص 204، تحقیق: سید احمد حسینی، کتابفروشی مرتضوی، تہران، طبع سوم، 1375ش؛ ابن منظور، محمد A بن مکرم، لسان العرب، ج 2، ص 41، نشر دار صادر، بیروت، طبع سوم، 1414ھ.

[5]. مجمع البحرین، ج 2، ص 204؛ لسان العرب، ج 2، ص 41؛ حلّی، مقداد بن عبد اللہ سیوری، کنز العرفان فی فقہ القرآن، ج 2، ص 12، قم، طبع اول، بی تا.

[6] پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ان موارد کو سحت کے مصادیق میں سے جانا گیا ہے، مردار کی قیمت، کتا، شراب، زنا کار عورت کا مہریہ، حکم صادر کرنے میں رشوت، کاھن کی اجرت (شیخ صدوق، من لایحضرہ الفقیہ، ج 4، ص 363، انتشارات جامعہ مدرسین، قم، 1413ھ).

[7] عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ علیہ السلام: قَالَ: سَأَلْتُهُ عَنِ السُّحْتِ فَقَالَ: الرِّشَا فِي الْحُكْمِ (کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، ج 5، ص 127، دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، 1365ھ ـ ش).

[8] الکافی، ج 5، ص 127.

[9] کنز العرفان فی فقہ القرآن، ج 2، ص 12.

[10] کاظمی، فاضل، جواد بن سعد اسدی، مسالک الافہام الی آیات الاحکام، ج 3، ص 9، بی جا و بی تا.

[11] المیزان فی تفسیر القرآن، ج 5، ص 341.

[12] کنز العرفان فی فقہ القرآن، ج 2، ص 13

قرآن مجید کے نظریہ کے مطابق خودآ گاہی کے معنی کیا ہیں؟

مختصر جواب

قرآن مجید کے مطابق، خودآ گاہی کے معنی یہ ہیں کہ انسان، اپنی فطرت اور باطن میں موجود استعدادوں کی پرورش کرے اور زندہ کر کے اپنی حقیقت کو دوبارہ پائے اور اس کے بعد ہستی اور اسماء وصفات الٰہی کا قلباً ادراک کرے۔

خود آ گاہی کے مختلف مراتب اور درجے ہیں، جیسے: فطری خودآ گاہی، عالمی خودآ گاہی اور عرفانی خودآ گاہی اور ان میں سے مکمل مرتبہ عرفانی خودآ گاہی ہے، اور یہ خودآ گاہی، انسان، یعنی خلیفہ الٰہی، کا حقیقت و اصلیت کے ساتھ پیوند ہے۔

تفصیلی جوابات

قرآن مجید کے مطابق، خودآ گاہی کے معنی یہ ہیں کہ انسان، اپنی فطرت اور باطن میں موجود استعدادوں کی پرورش کرے اور زندہ کر کے اپنی حقیقت کو دوبارہ پائے اور اس کے بعد ہستی اور اسماء وصفات الٰہی کا قلباً ادراک کرے۔ پس انسان کی ذات اور ذاتی جوہر، خودکو دوبارہ پانا اور خودآ گاہی حاصل کرنا ہے[1]، اور فطری طور پر انسان اس کے ساتھ عشق و محبت کرتا ہے۔

اس لحاظ سے، خودآ گاہی کے مختلف مراتب اور درجے ہیں [2] اور اس کا مکمل مرتبہ عرفانی خودآ گاہی ہے، اور یہ خودآ گاہی، انسان، یعنی خلیفہ الٰہی کا حقیقت و اصلیت کے ساتھ پیوند ہے۔

ہم اس مقالہ میں خودآ گاہی کے مختلف مراتب پر اجمالی طور پر روشنی ڈالیں گے:

ا۔فطری خودآ گاہی:

یہ آ گاہی، فکر وغور کی قسم اور حصولی علم نہیں ہے [3]، بلکہ ایک بیداری اور حضوری علم ہے۔ حضوری خودآ گاہی، یعنی میں ہوں اور اپنی باطنی استعدادوں کے ذریعہ اس ہستی کی آ گاہی رکھتا ہوں۔ یہ خودآ گاہی، اصلی اور حقیقی ہے اور انسان کی عین شخصیت ہے۔ اس خودآ گاہی میں، انسان میں نام کی ایک حقیقت کو پاتا ہے، جو اس کی شخصیت کی عین آ گاہی ہے [4]۔

البتہ، اس مظہر میں، عام طور پر بلاواسطہ اور براہ راست میں پر تسلط نہیں جمایا جا سکتا ہے، بلکہ پہلے انسان کی باطنی طاقت اور فعالیتوں کا ادراک ہوتا ہے، پھر حضوری خودآ گاہی کے لئے میں کا ادراک ہوتا ہے [5]۔

قرآن مجید، رحم میں جنین کی خلقت کے مراحل کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے، اس کے آخری مرحلہ کے عنوان سے، جو حقیقت میں انسان کی خلقت کا سب سے اہم مرحلہ ہے [6]، ارشاد فرماتا ہے: ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ [7] (پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا)، اسی کی طرف اشارہ ہے کہ مادہ خودبخود خودآ گاہی روحانی جوہر میں تبدیل ہوتا ہے [8]۔ بہ الفاظ دیگر اسے صاحب حیات وقدرت وعلم بنا دیا اور اسے ذاتی جوہر عطا کیا، جسے میں کہتے ہیں [9]۔

۲۔ عالمی خودآگاہی:

عالمی خودآگاہی، یعنی عالم کی بہ نسبت اپنے بارے میں آگاہی کہ: میں کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں پر ہوں؟ کہاں جا رہا ہوں؟ اور اس خودآگاہی میں انسان انکشاف کرتا ہے کہ وہ عالم نام کے ایک کل کا جزء ہے، وہ جانتا ہے کہ آزاد نہیں ہے بلکہ وابستہ ہے، یعنی، خود نہیں آیا ہے، خود زندگی نہیں گزارتا ہے، اور اس دنیا سے خود نہیں جا رہا ہے، وہ اس کل میں اپنی حالت کو مشخص کرنا چاہتا ہے[10]۔ امام علیؑ نے اپنے بامعنی کلام میں اس قسم کی خودآگاہی کے بارے میں فرمایا ہے: خدا اس پر رحمت کرے، جو جانتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں پر ہے؟ اور کہاں جا رہا ہے؟[11]

قرآن مجید میں انسان کے مبدا و معاد کے بارے میں بکثرت آیات موجود ہیں، جو انسان کو دنیا و آخرت کی زندگی کی حقیقت کے بارے میں بیداری و آگاہی حاصل کرنے کی دعوت دیتی ہیں:

ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں۔[12]

وہ خدا، وہ ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے پھر ایک مدت کا فیصلہ کیا ہے (تاکہ انسان کمال حاصل کرے) اور مقررہ مدت اس کے پاس اور بھی ہے (جس سے صرف وہی آگاہ ہے)۔[13]

اللہ ہی وہ ہے جس نے تم سب کو خلق کیا ہے پھر روزی دی ہے پھر موت دیتا ہے پھر زندہ کرتا ہے۔۔۔[14]

۳۔ عرفانی خودآگاہی:

عرفانی یا عارفانہ خودآگاہی، خداوندمتعال کے ساتھ رابطہ کے سلسلہ میں اپنے بارے میں آگاہی ہے۔ یہ رابطہ، دو ایسے موجود کے درمیان نہیں ہے جو ایک دوسرے کے

متوازی قرار پائے ہیں۔ بلکہ فرع کے اصل سے رابطہ کی قسم ہے، جائز کے واحد حقیقت (حق تعالیٰ) سے اور مقید کے مطلق سے رابطہ کی قسم ہے، عارف کی کسک ایک اندرونی کسک ہوتی ہے اور فطری ضرورت سے پیدا ہوتی ہے[15]۔

عارف کی نظر میں، روح و جان، حقیقی میں نہیں ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں آگاہی، خود آگاہی نہیں ہے بلکہ روح و جان، خود اور میں کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہوتا ہے اور حقیقی میں خداوند متعال ہے۔ اگر انسان خود سے فانی ہو جائے اور تعینات کو توڑ پھوڑ کے انہیں مدنظر نہ رکھے تو روح و جان کا وجود باقی نہیں رہتا ہے اور اس طرح انسان حقیقی خودآگاہی کی منزل تک پہنچتا ہے[16]۔

اگر انسان، اپنی فطری اور عالمی خودآگاہی کو پرورش بخشے اور اپنی اصلیت (خلیفہ الٰہی ہونے) سے آگاہ ہو جائے، تو اس نے اس عارفانہ خودآگاہی کے میدان میں قدم رکھا ہے اور اس عارفانہ رابطہ کا ادراک کیا ہے اور خدا کی طرف سے اس کے لئے عشق و محبت اور اپنی طرف سے خدا کے عشق و محبت کو دل میں محسوس کرتا ہے: یحبّھم و یحبّونہ[17] عارفانہ خودآگاہی، فطری اور عالمی خودآگاہی کی پرورش یافتہ ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں خداوند متعال کے ارشاد کے مطابق، جو چیز خودآگاہی کے منافی اور اس کے لئے رکاوٹ ہے، وہ خود فراموشی ہے، جو خدا فراموشی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے: اور خبردار ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے خود ان کے نفس کو بھی بھلا دیا اور وہ سب واقعی فاسق اور بدکار ہیں۔[18]

کیونکہ جب انسان خدا کو فراموش کرتا ہے، تو وہ خداوند متعال کے اسمائے حسنیٰ اور عالی صفات کو بھی فراموش کرتا ہے، جن کے ساتھ اس کا براہ راست رابطہ ہوتا ہے۔ اگر انسان اپنی خودآگاہی کی کوشش و تلاش میں نہ ہو اور اسے اپنے اندر زندہ نہ کرے، تو اس نے خدا کو

بُھلا ڈالا ہے اور وہ ہر گناہ کا مرتکب ہو کر عبودیت و بندگی سے خارج ہوتا ہے[19]۔

حواشی

[1]. مطہری، مرتضی، مجموعہ آثار، ج 2، ص 304 و 308، انتشارات صدرا.

[2]. ملاحظہ ہو: مجموعہ آثار، ج 2، ص 308 - 326.

[3]. اس کے برخلاف جب ماہر نفسیات خود آگاہی کی بحث کرتے ہیں، علم حصول اور ذہن کے طریقے سے اپنے بارے میں آگاہی کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ (مجموعہ آثار، ج 2، ص 309).

[4]. مجموعہ آثار، ج 2، ص 308،

[5]. ملاحظہ ہو: جعفری، محمد تقی، ترجمہ وتفسیر نہج البلاغہ، ج 6، ص 262، و ج 26، ص 61 و 62، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، طبع ہفتم، 1376ھ ش.

[6]. مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج 14، ص 208، دارالکتب الاسلامیۃ، تہران، طبع اول، 1374ھ ش.

[7]. مؤمنون، 14.

[8]. مجموعہ آثار، ج 2، ص 309.

[9]. طباطبایی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج 15، ص 20، دفتر انتشارات اسلامی، قم، طبع پنجم، 1417ھ.

[10]. مجموعہ آثار، ج 2، ص 310.

[11]. ''رحم اللہ امرأ أعدلنفسہ، واستعدلرمسہ، وعرف من أین وفی أین والی أین'' (مغنیۃ، محمد جواد، فی ظلال نہج البلاغہ، ج 1، ص 22، دارالعلم للملایین، بیروت، طبع سوم، 1358 ش؛ نقوی قاینی خراسانی، سید محمد تقی، مفتاح السعادۃ فی شرح نہج البلاغہ، ج 5، ص 128، مکتبۃ المصطفوی، تہران، بی تاریخ).

[12]. بقرہ، 156.

[13]. انعام، 2.

[14]. روم، 40.

[15]. مجموعہ آثار، ج 2، ص 319 و 320.

[16]. مجموعہ آثار، ج2، ص321.

[17]. مائدہ، 54.

[18]. حشر، 19.

[19]. ملاحظہ ہو: المیزان فی تفسیر القرآن، ج19، ص219 و220.

کیا قرآن مجید کی نظر میں حکمت اور علم کے درمیان کوئی فرق ہے؟

مختصر جواب

حکمت کے لغوی معنی، حق وحقیقت کے مطابق گفتار و کردار یا علم وعقل یا انسان کو حق کے امر پر واقف کرنے والی چیز کے ذریعہ حق تک پہنچنا ہے۔علم جاننا،کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنا اور بہ الفاظ دیگر دانش و آ گاہی ہے۔

قرآن مجید میں حکمت وعلم: لفظ حکمت، قرآن مجید میں متعدد بار دہرایا گیا ہے، اور اس کے معنی ومفہوم کے بارے میں مفسرین نے مختلف اقوال بیان کئے ہیں۔بعض مفسرین کہتے ہیں کہ: اس سے مراد نبوت ہے۔بعض کہتے ہیں: اس سے مراد شرایع اور حلال وحرام کا علم ہے اور کچھ مفسرین اس کوقرآن مجید کا علم جانتے ہیں، اور بعض نے اسے خدا کے پیغام کی حقیقت تک پہنچنا بیان کیا ہے۔لیکن علامہ طبا طبائیؒ کا قول، جامع اقوال ہے، اس طرح کہ اس کے مصادیق کے طور پر دوسرے اقوال بھی ہو سکتے ہیں۔اور وہ فرماتے ہیں: حکمت کے معنی،عملی صورت کا محکم اور یقینی ہونا ہے۔ چونکہ حکمت استحکام کی علامت اور نا قابل زوال کے معنی میں ہے اور خداوند متعال نے قرآن مجید کو کتاب حکیم کہا ہے، اور یہ اس لئے ہے کہ قرآن مجید وقت پر بات کرتا ہے، اچھی بات کرتا ہے اوراس کے ساتھ برہان و دلیل بھی پیش

کرتا ہے۔

لفظ علم کو بھی قرآن مجید میں کافی دہرایا گیا ہے اور اس لفظ کو جاننے، اظہار و وضاحت اور دلیل و حجت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مادہ علم اور اس کے مشتقات کے بارے میں دقت نظر سے تحقیق اور تجزیہ کے بعد اس طرح اظہار کیا جا سکتا ہے کہ تمام مخلوقات علم رکھتی ہیں۔ علامہ طباطبائی آیہ شریفہ وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰـكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ ؕ کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ: جملہ لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو۔ اس بات کی دلیل ہے کہ مخلوقات کی تسبیح زبان قال کے علم پر مبنی ہے، کیونکہ اگر مخلوقات کی زبان حال اور وجود صانع پر ان کی دلالت مراد ہوتی تو اس ارشاد الٰہی کے کوئی معنی نہیں تھے کہ: تم ان کی تسبیح کو نہیں سنتے ہو؛ اس معنی کی دلیل پیش کرنے والی دوسری آیات بھی موجود ہیں۔

حکمت اور علم میں فرق: حکمت و علم کو کبھی خداوند متعال سے نسبت دی جاتی ہے، کیونکہ خداوند متعال کی حکمت، انتہائی پائیدار اور فضولیات سے پاک مخلوقات کو پیدا کرنا ہے اور یہ پیدا کرنا خداوند متعال کے لامتناہی علم پر مبنی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حکمت و علم خداوند متعال کی صفات میں سے ہیں، لیکن اگر فعل الٰہی، حکمت، استحکام اور حق پر مبنی ہو اور باطل سے منزہ و پاک ہو، تو اس صورت میں حکمت، خدا کی صفت ہو سکتی ہے۔ بہر حال چونکہ خداوند متعال کی صفات عین اس کی ذات ہیں، اس لئے حقیقت میں ان دو صفتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، لیکن اعتبار کے لحاظ سے فرق ہونا ممکن ہے۔ حکیم و علیم دونوں لفظ پروردگار عالم کی دانائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، لیکن حکمت عام طور پر عملی پہلو بیان کرتی ہے، اور علم نظری پہلو کا اظہار کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر، علم کی صفت، خداوند متعال کی لامتناہی آگاہی ہے اور حکیم کی صفت، حساب و مقصد کے لحاظ سے کائنات کو پیدا کرنے اور قرآن مجید کو نازل کرنے میں

استعمال ہوئی ہے جو خداوند متعال کی لامتناہی آگاہی پر دلالت کرتی ہے۔ کبھی ان دوصفتوں کو انسان سے نسبت دی جاتی ہے کہ انسان میں حکمت، مخلوقات کو پہچاننے اور نیک اور پسندیدہ کام انجام دینے کے معنی میں استعمال ہوتی ہے، اور وہ حکیم ہوتا ہے جو اہل معرفت ہو اور گہری سوچ اور عقل سلیم رکھتا ہو۔ امام موسی بن جعفر علیہ السلام نے فرمایا ہے: حکمت سے مراد، فہم و عقل ہے۔ پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ: حکمت ایک حالت اور ادراک کرنے اور تشخیص کرنے کی ایک خصلت ہے جو ایک ایسے علم پر مبنی ہے جس کی حقیقت کا مالک خداوند متعال ہے۔ بلکہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: خداوند متعال، خود علم ہے کہ اس میں جہالت کی گنجائش نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر علم کے مختلف مراتب ہیں اس کا عالی ترین مرتبہ ہستی باری تعالی ہے اور انسان کے علاوہ غیر ذوی العقول مخلوقات بھی علم رکھتے ہیں اور تمام مخلوقات اور علم کے درمیان ان کی ظرفیت اور وجود کے مطابق نسبت معین کی جاسکتی ہے، جبکہ اس کے برعکس حکمت صرف ذوی العقول کی خصوصیت اور صفات میں شمار ہوتی ہے۔

تفصیلی جوابات

لغوی معنی: حکمت علم و عقل کے ذریعہ حق و حقیقت تک پہنچنا ہے[1]۔ یہ لفظ مادہ حکم سے ہے اور روکنے اور منع کے معنی میں ہے۔ اور اس کے پہلے معنی ہیں حکم دینا جو ظلم کو روکنے کا سبب بن جاتا ہے۔ حکمت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان سے جہالت اور نادانی کو دور کرتی ہے[2]۔ لیکن علم دانست، دانش[3]، ادراک اور کسی چیز کی بنیاد یا حقیقت کو سمجھنے کے معنی میں ہے[4]، اور علم بعض نتائج پر دلالت کرتا ہے جو اشیاء میں پائے جاتے ہیں اور ان کے ذریعہ چیزوں کے درمیان تمیز اور تشخیص کی جاسکتی ہے[5]۔

قرآن مجید میں علم و حکمت:

قرآن مجید میں لفظ حکمت بیس بار دہرایا گیا ہے۔ حکمت کی وضاحت اور تفسیر میں

مفسرین نے مختلف اقوال بیان کئے ہیں، جن میں سے اہم حسب ذیل ہیں:

۱۔ حکمت سے مراد نبوت ہے[6]۔ چنانچہ آیہ شریفہ میں آیا ہے: اور داود نے جالوت کوقتل کر دیا اور اللہ نے انہیں ملک اور حکمت (نبوت) عطا کر دی[7]۔

۲۔ اس سے مراد شرائع (حلال وحرام کا علم) ہے[8]۔ اور آیہ شریفہ میں آیا ہے: اور خداوند متعال اس کو کتاب وحکمت (حلال وحرام کا علم) اور توریت وانجیل کی تعلیم دے گا[9]۔

۳۔ بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق حکمت سے مراد قرآن مجید کا علم اور ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، مقدم و موخر وغیرہ سے آگاہی ہے[10]۔ آیہ شریفہ میں آیا ہے کہ: وہ جس کو بھی چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا کر دی جائے اسے گویا خیر کثیر عطا کر دیا اور اس بات کو صاحبان عقل کے علاوہ کوئی نہیں سمجھتا[11]۔

۴۔ بعض مفسرین کے قول کے مطابق، اس سے مراد، قول وفعل کے میدان میں خدا کے پیغام کی حقیقت تک پہنچنا ہے[12]۔

۵۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے: اس سے مراد دین کا وسیع علم ہے[13]۔

۶۔ بعض مفسرین کے اعتقاد کے مطابق اس لفظ کا مفہوم دین کے بارے میں صحیح فہم وادراک ہے[14]۔

۷۔ بعض مفسرین کا یہ اعتقاد ہے کہ حکمت ایک ایسا علم ہے جو نفع و فائدہ سے سرشار اور انسان ساز ہے[15]۔

۸۔ آخر کار مرحوم علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: حکمت کے معنی، عملی صورت کا محکم و مستحکم ہونا ہے[16]۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ معنی مذکورہ نظریات کا جامع ہے۔ حقیقت میں مذکورہ اقوال اس معنی کے مصادیق ہیں۔ کیونکہ لفظ محکمہ، حکمت اور اس جیسے الفاظ، استحکام کے معنی کی

علامتیں ہیں اور اس کے معنی مستحکم اور نا قابل زوال ہونے کے ہیں [17]۔ خداوند متعال نے قرآن مجید کا نام کتاب حکیم رکھا ہے، وہ اس لئے کہ قرآن مجید بر وقت بات کرتا ہے، اچھی بات کرتا ہے اور اس کے ساتھ دلیل و برہان پیش کرتا ہے۔ جس بات میں برہان نہ ہو وہ مستحکم نہیں ہوتی ہے [18]۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خداوند متعال نے مجھے قرآن مجید کی شکل میں گراں قیمت نعمت عطا کی ہے اور اس کے ذریعہ مجھے حکمت بھی دی ہے، اور جس گھر میں حکمت سے استفادہ نہ کیا جائے وہ کھنڈر ہے، اس لئے علم و دانش کو حاصل کرو، ایسا نہ ہو کہ نادانی اور لاعلمی کی حالت میں مر جاو [19]۔

لفظ علم قرآن مجید میں ۱۵۰ بار دہرایا گیا ہے، لیکن اس کے مشتقات قرآن مجید میں بہت زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید میں بعض اوقات جاننے کے معنی میں آیا ہے: قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ [20]، بعض اوقات اظہار اور وضاحت کے معنی میں آیا ہے: ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ﴿۱۲﴾ [21]۔ علامہ طبا طبائی لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ کے ذیل میں فرماتے ہیں، علم کا مراد فعلی ہے اور یہ کسی شئے کے خدا کے ہاں خاص وجود میں ظہور اور حضور ہے۔ اس معنی میں علم قرآن مجید میں زیادہ استعمال ہوا ہے اور کبھی دلیل و حجت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے [22]۔

مجموعی طور پر جب ہم ان آیات کی جانچ پڑتال اور اس مادہ اور اس کے مشتقات پر بحث کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام مخلوقات صاحب علم ہیں۔ چنانچہ، علامہ طبا طبائی آیہ شریفہ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ؕ کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ جملہ: لیکن ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہیں اس بات کی بہترین دلیل ہے، مخلوقات کی تسبیح سے مراد، علم اور زبان حال کی بنیاد پر تسبیح ہے، کیونکہ اگر مراد زبان حال مخلوقات اور وجود صانع پر ان کی دلالت ہوتی تو اس کے کوئی معنی نہیں تھے، فرماتے ہیں: تم

ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو[23]۔ اس معنی کی دوسری آیات بھی دلالت کرتی ہیں، جیسے: اس دن (زمین) اپنی خبریں بیان کرے گی، کہ تمہارے پروردگار نے اسے اشارہ (وحی) کیا ہے[24]۔ اسی طرح کچھ آیات انسانوں کے بدن کے اعضاء کی گواہی، خدا سے گفتگو کرنے، خدا کی طرف سے جواب دینے پر دلالت کرتی ہیں۔ البتہ قابل توجہ بات ہے کہ علم کے مختلف مراتب ہیں۔

حکمت اور علم میں فرق:

ان دو الفاظ کے درمیان فرق کو بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم جان لیں کہ حکمت و علم کی واجب الوجود (خدا) سے نسبت دی جاتی ہے[25]۔ کہ قرآن مجید میں خداوند متعال کی توصیف کے طور پر بانوے بار لفظ حکیم اور ایک سو چھپن بار لفظ علیم استعمال ہوا ہے۔ حکیم اور علیم ایک جہت سے خداوند متعال کی صفات ہیں، کیونکہ خدا کی حکمت، یعنی انتہائی استحکام و پائداری کے ساتھ اور فضولیات کے بغیر مخلوقات کو پیدا کرنا، خداوند متعال کے اس لامتناہی علم پر مبنی ہے، جو خداوند متعال کی صفات ذات میں سے ہے۔ اگرچہ حکمت، صفت فعل بھی ہے، کیونکہ فعل بھی حکمت، استحکام اور حق پر مبنی ہے اور باطل سے پاک و منزہ ہے۔ بہرحال چونکہ خداوند متعال کی ذاتی صفات اس کی عین ذات ہیں، اس لئے ان دو کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، مگر اعتبار کے لحاظ سے، کیونکہ حکیم و علیم دونوں پروردگار عالم کی دانائی کی طرف اشارہ ہیں، لیکن حکمت، عام طور پر عملی پہلو بیان کرتی ہے۔ اور علم نظری پہلو بیان کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر علیم خداوند متعال کی لامتناہی آگاہی کی خبر دیتا ہے اور حکیم کی صفت، جو حساب و مقصد کے لحاظ سے کائنات کو پیدا کرنے اور قرآن مجید کو نازل کرنے میں استعمال ہوئی ہے خداوند متعال کی لامتناہی آگاہی کی خبر دیتی ہے[26]۔ بعض اوقات ان دو صفتوں کو ممکن الوجود صاحب عقل (انسان) سے نسبت دی جاتی ہے، کہ انسان میں حکمت،

مخلوقات کو پہچاننے اور نیک و پسندیدہ کام انجام دینے کے معنی میں استعمال ہوتی ہے[27]۔ بہ الفاظ دیگر، قدروں اور معیاروں کی معرفت، جس کے ذریعہ انسان کو پہچان لے اور باطل کو ہر صورت میں تشخیص دے حکمت ہے اور یہ وہی چیز ہے، جس کی بعض فلاسفہ نے کمال قوہ نظریہ سے تعبیر کی ہے[28]۔ لہٰذا، حکیم وہ ہے، جو اہل معرفت اور گہرے فہم اور عقل سلیم کا مالک ہو۔ امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام نے ہشام بن حکم سے فرمایا: حکمت سے مراد فہم و عقل ہے[29]۔ نتیجہ کے طور پر حکمت ادراک اور تشخیص کی ایک حالت اور خصوصیت ہے جو علم پر مبنی ہے، جس کی حقیقت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: خداوند متعال بذات خود علم ہے جس میں جہالت کی کوئی گنجائش نہیں ہے[30]۔ یہ وہی حقیقت ہے جو لقمان نے خداوند متعال سے حاصل کی تھی[31]۔ فلاسفہ کی ایک جماعت کا یہ اعتقاد ہے کہ سوچ، مطالعہ اور غور وفکر، علم و دانش کو پیدا نہیں کر سکتے ہیں، بلکہ انسانی روح کو معقولات قبول کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں اور جب انسان کی روح معقولات کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوتی ہے تو خالق کائنات کا فیض انسان کی روح پر برستا ہے[32]۔ اس کے بعد عمل کے مرحلہ میں انسان کے لئے ادراک و تشخیص کی حالت اور خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔ پس بہ الفاظ دیگر انسان کا عمل علم کو قبول کرنے کے لئے روح کو آمادہ کرنے کا سبب بن جاتا ہے اور علم کو قبول کرنا حق کو باطل سے متمیز کرنے اور معانی و مقاصد کا ادراک کرنے کے لئے انسان میں روحانی حالت پیدا کرنے کا مقدمہ اور سبب بن جاتا ہے۔

آخری نکتہ:

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ، علم کے کئی مراتب ہیں، ہستی (باری تعالیٰ) کے عالی ترین مرتبہ کے علاوہ انسان، اور غیر ذوی العقول مخلوقات بھی علم رکھتے ہیں اور عالم ہستی کی تمام مخلوقات اور علم کے درمیان ان کے وجودی تناسب اور ظرفیت کے مطابق نسبت پائی جاتی

ہے۔اس کے برعکس حکمت، صرف ذوی العقول کی خصوصیت اور صفت ہے۔

حواشی

[1] مفردات راغب، مادہ حکم.

[2] معجم مقاييس اللغۃ، مادہ حکم.

[3] قرشی، قاموس قرآن، ج 5،ص 32، مادہ حکم.

[4] مفردات راغب، مادہ حکم.

[5] معجم مقاييس اللغۃ، مادہ علم.

[6] مجمع البيان، 10 جلدی، انتشارات: مؤسسہ الأعلمی للمطبوعات، تاریخ: 1415 ہ ق: ج 2،ص 151.

[7] بقرہ، 251.

[8] مجمع البیان، ایضاً،ص 298.

[9] آل عمران، 48.

[10] مجمع البیان، ایضاً،ص 194.

[11] بقرہ، 269.

[12] مجمع البیان، ایضاً.

[13] ایضاً.

[14] ایضاً.

[15] ایضاً.

[16] علامہ طباطبایی، محمد حسین، تفسیر المیزان، ترجمہ موسوی ہمدانی، ناشر: بنیاد علمی وفکری علامہ طباطبایی، تاریخ 1363، ج 2،ص 351.

[17] جوادی آملی، عبداللّٰہ، قرآن درقرآن (تفسیر موضوعی)، انتشارات اسوہ، ج 1،ص 297.

[18] ایضاً.

[19] سیوطی، الدر المنثور، ج 1،ص 335.

[20] بقرہ، 6.

[21] کہف، 12.

[22] کہف، 4 و 5.

[23] علامہ طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیزان، ایضاً، ج 17، ص 609.

[24] زلزال، 5.

[25] بقرہ، 27.

[26] مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، ج 15، ص 399.

[27] مفردات راغب، مادہ حکم.

[28] نمونہ، ایضاً.

[29] نمونہ، ایضاً، ج 17، ص 37.

[30] عاملی، شیخ حر، الفصول المہمۃ فی اصول الائمۃ، ج 1، ص 228.

[31] لقمان، 12.

[32] نمونہ، ایضاً، ج 16، ص 349.

قرآنی رو سے انسان ایک بڑا ظالم اور نادان وجود ہے یا خلیفۃ اللہ؟

مختصر جواب

۱۔قرآن نے ایک طرف متعدد جگہوں پر انسان کے بلند و بالا رتبہ کا اعلان کیا ہے لیکن دوسری طرف بہت سی آیتوں میں اس کی مذمت اور سرزنش بھی کی ہے۔

۲۔ انسان کی حرکت، بے انتہا بلندی و پستی کی سمت ہوتی ہے اور اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔اور یہ انسان کی غیر معمولی صلاحیت کے سبب ہے۔

۳۔انسان دو پہلومخلوق ہے؛ ایک روحانی وملکوتی اور دوسری حیوانی ونفسانی۔

۴۔انسان دوسرے موجودات کے برخلاف ارادہ واختیار سے بہرہ مند ہے اور خود ہموار کی ہوئی زمین پر اپنے اختیار کے ساتھ زندگی کا راستہ انتخاب کرتا ہے۔

۵۔ وہ لوگ خلیفۃ الٰہی کے منصب تک پہنچتے ہیں جو الٰہی ہدایت کو اپنائیں اور سرکش آرزؤں اور حیوانی صفات کو کنٹرول کریں۔

تفصیلی جوابات

قرآن کریم کا سرسری مطالعہ کرکے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ انسان کے بارے میں دوطرح کی آیات ملتی ہیں: پہلے دستہ میں وہ آیتیں ہیں جو انسان کی عظمت بیان

کرتی ہیں اوراس کی شان کو بیان کرتی ہیں۔مثلاً یہ آیتیں:

۱۔ اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی ہے اور انہیں خشکی اور دریاؤں میں سواریوں پر اٹھایا ہے، انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے۔[1]

۲۔ اے رسول. اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں اور انہوں نے کہا کہ کیا اسے بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے اورخونریزی کرے جب کہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں تو ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے[2]۔

۳۔ بیشک ہم نے امانت کو آسمانً زمین اور پہاڑ سب کے سامنے پیش کیا اور سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اورخوف ظاہر کیا پس انسان نے اس بوجھ کو اٹھالیا کہ انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان ہے۔[3]

دوسرے دستہ میں وہ آیتیں ہیں جن میں انسان کی مذمت کی گئی ہے اور سخت لفظوں میں اس کی سرزنش کی گئی ہے مثلاً: وہ بالکل مایوس اور بے آس ہوجاتا ہے[4]،انسان سرکشی کرتا ہے[5]، بیشک انسان بڑا ظالم اور انکار کرنے والا ہے[6]،انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان ہے[7]، ہمارا کھلا ہوا دشمن ہوگیا ہے[8]، بے شک انسان خسارہ میں ہے[9] وغیرہ۔

اب ان آیات کو ملاحظہ کرنے کے بعد یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر بات کیا ہے؟ ظاہری اعتبار سے ان متضاد آیتوں کی مراد کیا ہے؟

اس سوال کے جواب کے لئے بہتر ہے کہ خود قرآن سے مدد لیں ؛ چونکہ اس آسمانی کتاب کی بعض آیتیں بعض دوسری آیتوں کی تفسیر کرتی ہیں۔

سورہ بیّنۃ میں ہم پڑھتے ہیں:

بے شک اہل کتاب میں جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے اور دیگر مشرکین سب جہنمؔ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور یہی بدترین خلائق ہیں اور بے شک جو لوگ ایمان لائے ہیں اورانہوں نے نیک اعمال کاانجام دیئے ہیں وہ بہترین خلائق ہیں[10]۔

ایک سورے کی ان دو ملی ہوئی آیتوں میں انسان کو بہترین اور بدترین دونوں کا عنوان دیا گیا ہے اور یہ اس کی بلندی اور پستی کی بےانتہائی کو بتاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایمان اور عمل صالح والا ہوگا تو اللہ کی بہترین مخلوق ہوگا اور اگر کفر و گمراہی اور الحاد و انکار کی راہ کو اپنائے گا تو اس طرح سقوط کرے گا کہ اللہ کی بدترین مخلوق ہوجائے گا۔

حضرت علی علیہ السلام ایک روایت میں فرماتے ہیں: اللہ نے کائنات کی خلقت کو تین طرح کا پیدا کیا: فرشتے، حیوان اور انسان؛ فرشتوں کے پاس عقل ہے لیکن شہوت وغضب نہیں ہے، حیوانات میں شہوت وغضب ہے لیکن عقل نہیں ہے، لیکن انسان کے پاس شہوت و غضب بھی ہے اور عقل بھی ان میں سے اگر عقل غالب آ گئی تو وہ فرشتوں سے بھی برتر ہے اور اگر شہوت وغضب غالب آ گئے تو حیوانوں سے بھی پست تر ہے[11]۔

اس نورانی روایت سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جس طرح انسان دو بعدی (روحانی و نفسانی) مخلوق ہے اسی طرح اس کے رجحانات اور خواہشات بھی دو طرح کے ہیں (روحانی رجحانات اور نفسانی رجحانات) اور وہ اللہ کی طرف سے عطا کئے گئے ارادہ و اختیار کی بنیاد پر ان میں سے کسی کا بھی انتخاب کر کے انسانی معراج پر پہنچ سکتا ہے یا پھر اتنا پست بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن کے بقول حیوان سے بھی گر جائے۔[12]

لہٰذا قرآن کی آیتیں اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ تمام انسان صلاحیت و استعداد کے مرحلے تک اس کی اہلیت رکھتے ہیں کہ بہترین محترم ترین بلکہ فرشتوں سے بھی

زیادہ برتر ہوجائیں اور وہ ان بالقوۃ صلاحیتوں کو فعال کر کے خلیفۃ اللہ کے درجہ تک پہنچ سکتے ہیں ؛ لیکن اگر اللہ کی عطا کردہ اس استعداد سے استفادہ نہ کریں تو الٰہی مذمت کے اہل قرار پائیں گے جس کا مختصر تذکرہ ہم نے کیا ہے۔

مزید معلومات کے لئے رجوع کریں:

المیزان (ترجمہ فارسی)، ج16، ص524-527؛ تفسیر نمونہ، ج8، ص242، ج17، ص451، 457

حواشی

[1] اسرا۔70

[2] بقرہ۔30

[3] احزاب۔72

[4] فصلت49۔50۔51

[5] علق۔6

[6] ابراہیمؑ۔34

[7] احزاب۔72

[8] یس۔77

[9] عصر۔2

[10] بیّنہ 6۔7

[11] تفسیر نور الثقلین، ج3، ص188

[12] أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ط، اعراف۔179

قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ ... کے کیا معنی ہیں؟ اور اس میں فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ ... فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ ؕ ... کی تکرار کی وجہ کیا ہے؟

سورہ بقرہ کی آیات: قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰهَا ۖ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَحَيۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ لَيَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۴﴾ (بقرہ، 144.) وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۹﴾ (بقرہ، 149). وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَحَيۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَيۡكُمۡ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ ۚ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِيۡ ۚ وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِيۡ عَلَيۡكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۰﴾ (بقرہ، 150)، میں فول وجهك شطر اور فولوا وجوهكم کی

تکرار کی وجہ کیا ہے؟

مختصر جواب

آیہ شریفہ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ○...کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبراسلام(ص) جب مسلمانوں اور یہودیوں کے قبلہ کی متابقت کی وجہ سے یہودیوں کے طعنوں سے پریشان ہوئے تھے، تو نصف شب کو آسمان کی طرف رُخ کر کے وحی الٰہی کے منتظر تھے کہ مسلمانوں کے قبلہ کی تبدیلی کا حکم ملے۔ بہرحال یہ درخواست یا اس اطلاع پر مبنی تھی کہ قبل از وقت تغییر قبلہ کے بارے میں حاصل کر چکے تھے یا اس دعا کی وجہ سے تھی جو بارگاہ الٰہی میں کی تھی۔لیکن آیت ۱۴۴، ۱۴۹ اور ۱۵۰ میں تکرار کی وجہ کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ اس تکرار کی مشترک اور اصلی وجہ مدّنظر حکم کی تاکید تھی اور اسلام میں اس حکم کی اہمیت کی علامت ہے۔ البتہ ان آیات میں سے ہر ایک کے کچھ جزئیات ہیں جو خود ان سے مخصوص ہیں اور بعض اوقات خاص مطالب خود پر مشتمل ہوتے ہیں۔من جملہ ان دو آیات میں دو یکساں تعبیریں اس کے امتیازات میں سے ہیں اور ان میں سے ایک تمام،موقعیتوں کے لئے حکم بیان کرنے کے مقام پر ہے اور دوسرا، حکم بھی قطعیت دکھانے کے علاوہ اصل حکم کا سبب بیان کرنے اور مخالفین کو ناامید کرنے کے لئے ہے۔

تفصیلی جوابات

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ○.. کے معنی واضح ہونے کے لئے سب سے پہلے ہم اس کی شان نزول بیان کرتے ہیں۔ صاحب تفسیر صافی فیض کاشانی اس آیہ شریفہ کے ذیل میں کہتے ہیں کہ: فقیہ میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم(ص) نے مکہ میں تیرہ سال تک اور مدینہ میں ۱۹ مہینوں [1] تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی۔اس کے بعد یہودی آپ(ص) کی عیب جوئی کرتے تھے کہ آپ(ص) ہمارے قبلہ کی پیروی کر رہے ہیں۔

پیغمبر اکرم(ص) اس وجہ سے کافی ناراض ہوئے اور جب نصف شب کو باہر نکلتے تھے تو، آسمان کی طرف رُخ کرتے تھے (خداوندمتعال سے درخواست کرتے تھے) اور اس کے بعد حسب معمول صبح کی نماز پڑھتے تھے اور جب (ظہر کا وقت آیا) اور ظہر کی نماز کی دو رکعتیں پڑھیں تو، جبرئیل آپ(ص) پر نازل ہوئے اور آپ(ص) کے لئے یوں مخاطب ہوئے: قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ○...[2]

فیض کاشانی آیت کی تفسیر کے بارے میں فرماتے ہیں: وحی کے انتظار میں (آنحضرت(ص)) اپنا رُخ آسمان کی طرف کرتے تھے اور کہا گیا ہے کہ رسول اللہ(ص) یہ امید رکھتے تھے کہ خداوندمتعال انہیں کعبہ کی طرف رُخ کرنے کو کہے گا، کیونکہ کعبہ آپ(ص) کے جد حضرت ابراہیمؑ کا قبلہ تھا۔۔[3]

اس مطلب کی مفسرین معاصر نے بھی تائید کی ہے اور نقل کیا ہے کہ: رسول خدا(ص) یہودیوں کے توہین آمیز تعصب سے پریشان تھے، اس لئے اس تعصب کے مقابلے میں۔۔۔ وحی الٰہی کے منتظر تھے۔۔۔پیغمبر اکرم(ص) کے لئے اس انتظار کا سبب خداوندمتعال کی طرف سے آپ(ص) کو گزشتہ وعدہ کے مطابق قبلہ کو بیت المقدس سے کعبہ کی طرف پلٹنے کا علم غیب تھا یا حالت وجد کی دعا وعبادت تھی نہ کہ پڑھنے والی[4]۔ اس مطلب کا مفہوم تفسیر المیزان میں بھی آیا ہے[5]۔

لیکن دوسرا سوال کہ **فول وجهك شطر** اور **فول وجوهكم** کے دہرائے جانے کی وجہ کے بارے میں پوچھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں سب سے پہلے عربی ادبیات میں تاکید اور اس کے ضروری یا غیر ضروری ہونے کے بارے میں گفتگو کرنی چاہئے اور اس کے بعد یہاں پر موجود اس تکرار پر بحث کریں گے۔

عربی ادبیات میں تکرار ایک رائج امر ہے اور بہت سے مواقع پر تکرار فصاحت

کلام کا سبب بن جاتی ہے، یہاں تک کہ بعض مواقع پر عدم تکرار ضعف فصاحت کا سبب بن جاتا ہے۔لیکن یہ تکرار اکسی سبب کے بغیر نہیں ہوسکتی ہے بلکہ اس کا کوئی سبب ہونا چاہئے۔ اس لحاظ سے فصاحت و بلاغت سے متعلق کتابوں میں آیا ہے کہ: تکرار اگرکسی فائدہ کے بغیر ہوتو کلام کی فصاحت میں عیب شمار ہوتی ہے[6]۔اس لحاظ سے کلام اللہ میں کثرت سے لفظی اور معنوی تکرار پائی جاتی ہے کہ مفسرین نے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں اسباب بتائے ہیں اور حکمتیں بیان کی ہیں۔

قرآن مجید میں سب سے زیادہ تکرار شدہ آیت، جو کافی فصاحت کا سبب بھی بنی ہے، سورہ رحمٰن کی آیہ شریفہ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ○ہے۔ اس آیہ شریفہ کی اس سورہ میں ۳۱ بار تکرار ہوئی ہے،لیکن اس کے باوجود کلام کی فصاحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتی ہے، بلکہ کلام کی فصاحت کو تقویت بخشتی ہے۔فصاحت میں یہ تقویت تکرار کے مفید ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس آیت کی تکرار کا فائدہ یہ ہے کہ، ہر نعمت کے ذکر کے بعد انسان کو ایک چابک لگانے کے مانند خدا کی نعمتوں کو جھٹلانے سے روکا جارہا ہے اور استفہامی سوال کی تکرار سے اس معنی کو ذہن نشین کرا رہا ہے، کہ کیا ان سب نعمتوں کے باوجود، خدا کی نعمتوں سے انکار کرتے ہو؟

لیکن سوال میں ذکر کی گئی آیت میں تکرار کی وجہ پر بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم تغییر قبلہ کے بارے میں حکم کی اہمیت پر بحث کریں۔ بیت المقدس کے مسلمانوں اور یہودیوں کے لئے مشترک قبلہ ہونا مسلمانوں کے لئے پریشانی کا سبب بنا تھا۔ اس سلسلہ میں یہودی، مسلمانوں کو ان کے قبلہ کی پیروی کرنے پر طعنہ دیتے تھے اور یہ امر مسلمانوں کے لئے اضطراب اور حزن کا سبب بنا ہوا تھا۔ اور یہ اس حد تک تھا کہ پیغمبر اکرم (ص) خداوند متعال کی طرف سے وحی پہنچنے اور قبلہ تبدیل ہونے کی توقع رکھتے

تھے، اس انتظار کی وضاحت بحث کی ابتدا میں آیت ۱۴۴ کے ذیل میں کی گئی۔

ہر دین میں قبلہ ایک انتہائی اہم مسئلہ شمار ہوتا تھا اور مسلمان بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ مسلمانوں کے لئے ایک مستقبل قبلہ کا ہونا، کافی اہمیت کا حامل تھا۔ جب آج لاکھوں انسان ایک مشترک قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، تو تغییر قبلہ اور کعبہ کو، مسلمانوں کا قبلہ معین کیے جانے کے حکم کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے جو آیات اس حکم کے بارے میں آئی ہیں، ان کی تکرار ہوئی ہے۔ اس تکرار، جن میں سے تقریباً ہر ایک میں خاص مطلب کی طرف اشارہ ہے، ذیل میں ہم ان پر بحث کریں گے۔ یہ سب تکراریں اس حکم کے بارے میں تاکید ہیں اور قبلہ کی اہمیت کا سبب بن گئی ہیں اور قرآن مجید میں شاذ و نادر صورت میں اس فرمان الٰہی کی تین آیات میں پانچ بار تکرار کی گئی (دو بار آیہ ۱۴۴ میں، ایک بار آیہ ۱۴۹ اور دو بار آیہ ۱۵۰ میں) لیکن ان میں ہر ایک کے درمیان کچھ جزئی فرق پایا جاتا ہے، اس پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا کہ ان تکراروں کے درمیان آپس میں کچھ فرق بھی پایا جاتا ہے، کہ تکرار کے ایک مطلوب اصول ہونے کے ضمن میں اس پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۴ میں یوں آیا ہے: **فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ ...** اور **فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ** ...ان دونوں میں سے ہر ایک، ایک خاص امر کی نشاندہی کرتا ہے اور ان کے مخاطب بھی مختلف ہیں۔ پہلے مورد میں پیغمبر اکرم (ص) کی طرف خطاب ہے اور ضمیر مفرد، مذکر، مخاطب سے استفادہ کیا گیا ہے اور یہ واضح کرنے کے لئے کہ مذکورہ حکم پیغمبر اکرم (ص) سے مخصوص نہیں ہے اور اس میں تمام زمان و مکان کے مسلمان شامل ہیں، فرمایا: (**وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ**)[7] کہ دوسرے مورد کے بارے میں ہے اور یہ حکم تمام مسلمانوں سے متعلق ہے اور تمام لوگوں کو کعبہ کو اپنا قبلہ قرار

دینے کا حکم دیتا ہے اور اس لئے ضمیر جملے سے استفادہ کیا گیا ہے۔

لیکن آیہ ۱۴۹، میں تھوڑا سا فرق ہے اور اس طرح آغاز ہوتا ہے: **وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ...** اس قید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف مسجد الحرام میں حاضر ہونے تک محدود نہیں ہے، بلکہ عمومیت پر مشتمل ہے، خواہ وطن میں ہوں یا سفر میں، اس حکم کا پابند ہونا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے یہاں پر تکرار کی حکمت و فائدہ یہ جانا گیا ہے کہ کعبہ کی طرف رخ کرنے کا ضروری ہونا۔ ایک عام حکم ہے اور ہر زمان و مکان پر مشتمل ہے اور اس حکم کا نماز کی حالت میں نازل ہونا، اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ حکم صرف اسی نماز اور اسی وقت سے مخصوص تھا۔[8]

یہ تکرار اور مختلف موارد کے بارے میں وضاحت کے ساتھ دہرانا، اس موضوع کی اہمیت بیان کرتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

اس حکم کو نسبتاً جزئی تر فرق کے ساتھ آیت نمبر ۱۵۰ میں دہرایا گیا ہے اور یہ آیت اس سے پہلے والی آیتوں کے ساتھ زیادہ تفاوت رکھتی ہے کہ کعبے کی طرف رخ کرنے کے علاوہ اس کے جزئیات بھی بیان کرتی ہے۔ اس آیت میں پیغمبر اکرم (ص) اور مسلمانوں سے الگ الگ خطاب کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند متعال کے پاس اس موضوع کی اہمیت کس قدر ہے، اس آیت کی تکرار، اس میں مضمر تاکید کے علاوہ، اور بھی اسباب ہیں اور ان ممکنہ اسباب میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

۱۔ تغییر قبلہ کی حکمت وسبب کو بیان کرنے کا ماحول پیدا کرنا[9]، کہ اس آیت کے ضمن میں یوں آیا ہے: **شَطۡرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَيۡكُمۡ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ** ۚ اور یہ تغییر قبلہ کا ایک سبب ہوسکتا ہے۔

۲۔ یہ دہرانا اس حکم کے مستحکم اور واقعی ہونے کی دلیل پیش کرتا ہے[10]۔

بعض مفسرین نے تاکید کے علاوہ کچھ اور مقاصد کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان آیات کی تکرار نہیں ہوسکتی ہے، کیونکہ ہر ایک کے نازل ہونے کا ایک خاص مقام ہے اور ان کا اپنا ایک خاص متعلّق ہے اور اس لحاظ سے یہ ایک دوسرے کی تاکید نہیں ہوسکتی ہیں۔ انہوں نے اس امر کو نمازگزاروں کے مختلف حالات سے متعلق جانا ہے۔ اس بنا پر پہلا امر ان سے متعلق ہے جو کعبہ کو دیکھتے ہیں، دوسرا امر مکہ کے باشندوں سے متعلق ہے اور تیسرا امر دوسرے شہروں کے باشندوں سے متعلق ہے، لیکن بعض مفسرین نے اس احتمال کے لئے کوئی دلیل نہیں دی ہے[11]۔

حواشی

[1]. البتہ اس بات پر اختلاف ہے کہ پیغمبر(ص) نے کتنی مدت تک مدینہ میں بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی۔.

[2]. فیض کاشانی، محمد محسن، تفسیر الصافی، جمی از مترجمان، ج1 ص 316 و 317، نوید اسلام، 1386ھ ش.

[3]. تفسیر صافی، ج1 ص 316.

[4]. جوادی آملی، عبد اللہ، تسنیم، ج7، ص 379 و 389، نشر اسراء، قم، 1384ھ ش.

[5]. طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، موسوی ہمدانی، محمد باقر، ج1، ص 489، انتشارات اسلامی.

6. ہاشمی، احمد، جواہر البلاغۃ، ص 27، اعتماد، طبع دہم، 1358

[7]. تسنیم، ج7، ص 389.

[8]. ایضاً، ص 468.

[9]. ایضاً، ص 478.

[10]. ایضاً.

[11]. ایضاً.